UNIVERSAL
LIBRARY
OU_226446
UNIVERSAL
LIBRARY

OUP—881—5-8-74—15,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. 13812 Acession No. ۲۹۲۵۱۸

Author سعید احمد س-ف

Title فہم القرآن

This book should be returned on or before the date last marked below.

فہمِ قرآن

تالیف

سعید احمد ایم اے

سلسلۂ ندوۃ المصنفین دہلی

(۶)

فہمِ قرآن

جس میں فہمِ قرآن سے متعلق تمام قدیم و جدید نظریوں پر نہایت مبسوط اور محققانہ بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کے آسان ہونے کی حقیقت کیا ہے، اور یہ کہ "وحیِ الٰہی" کا صحیح منشا معلوم کرنے کے لیے شارع علیہ السلام کے اقوال و افعال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں تدوینِ حدیث، فتنۂ وضعِ حدیث، اس فتنہ کے انسداد، احادیث کے پایۂ اعتبار، صحابہ کے عدول ہونے کی بحث، کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ کے سوانحِ حیات، دورِ تابعین کی خصوصیات اور دیگر اہم عنوانات پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے

تالیف

سعید احمد ایم اے فاضلِ دیوبند

منیجر ندوۃ المصنفین قرول باغ نئی دہلی کے اہتمام سے
جید برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی

قیمت غیر مجلد ... روپیہ

قیمت مجلد ... دو روپیہ

مکتبہ ... بریلی
... ملتی ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعض صاحبِ نظر دوستوں کے اصرار پر پہلے اس مضمون کا ایک حصہ برہان میں شائع کیا گیا تھا، اس وقت خیال بھی نہیں تھا کہ یہ مضمون مکمل ہو کر کتاب کی صورت میں شائع ہو سکے گا۔

لیکن جیسے جیسے اس کی قسطیں برہان میں شائع ہوتی گئیں پڑھنے والوں پر اس کی اہمیت واضح ہوتی گئی۔

یہانتک کہ اب سیکڑوں صفحوں کے اضافوں اور بہت سی ترمیموں کے بعد اسے کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

جہانتک موضوعِ بحث کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں یہ کتاب مواد کے لحاظ سے کچھ ایسی تہی مایہ نہیں ہے، پھر برادر محترم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے اپنی چند در چند انتظامی مصروفیتوں کے باوجود کتاب کے مسودہ کو غور سے دیکھا ہے اور موقع بہ موقع انھوں نے بہت سی مفید اصلاحیں بھی کی ہیں جنکی وجہ سے کتاب کے وزن اور اس کی افادی حیثیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ ایک پہلے سے غور کی ہوئی تصنیف میں جو ترتیب ہونی چاہئے اس کے اعتبار سے کتاب میں بعض نقائص رہ گئے ہیں جو امید ہے آئندہ ایڈیشن میں باقی نہیں رہیں گے، اس وقت تو جو کچھ "ماحضر" ہے قارئین کے سامنے پیش ہے۔

سعید احمد

۱۹ ربیع الاول ۵۹ھ

فہم قرآن

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
مسلمانوں میں مرکزیت کا فقدان	۱
جماعتی مرکز	۲
مسلمانوں کا مرکز کیا ہے	۳
فہم قرآن کی نسبت دو نئے خیال	۴
قرآن کے آسان ہونے کا غلط مطلب	〃
قرآن کے آسان ہونے پر چند نتائج کی غلط بنیاد	۵
ادعاء باطل کا اصل سبب	۶
قرآن مجید کے آسان ہونے کا واقعی مطلب	۸
قرآن مجید ہدایت و نصیحت کی کتاب ہے	۹
قرآنی تعلیمات سہل ہیں	۱۱
فہم قرآن سے مراد	۱۲
فہم قرآن کی پہلی شرط (عربیت)	۱۲
ایک دلچسپ واقعہ	۱۳
مذبذانی	〃
ہر کلام کا صحیح مفہوم ایک ہی ہوتا ہے	۱۴
بلاغت کے مختلف مدارج و مراتب	〃
تفسیر قرآن میں اسلاف کی احتیاط	۱۶
دنیوی امور میں ماہرین کی طرف مراجعت کی جاتی ہے	۱۷
دو اماموں کی رائے	۱۸
زبان کے ادب و بلاغت کا ذوق	۱
نعمت خداداد ہے	۲۰
دوسری شرط	۲۱
سب صحابہ فہم قرآن میں یکساں نہیں تھے۔	۲۴
حضرت عمر کا ذوق قرآنی	۲۵
حضرت ابن عباس کی رمز شناسی	۲۶
تیسری شرط (اتقاء)	۲۸
اتقاء کی ایک عقلی توجیہ	۳۲
چوتھی شرط	۳۳
ایک شبہ اور اس کا جواب	۳۶
احکام قرآنی میں بصیرت	۴۰
ایک نکتہ	۴۲
ناسخ و منسوخ	۴۲
نسخ سے مفسرین کی مراد	۴۳
قرآن میں نسخ کی حقیقت	۴۸
ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۵۲
مفتی محمد عبدہ کی تقریر کا خلاصہ	〃
حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی تقریر کا خلاصہ	۵۴
تفسیر و تاویل کا فرق	۵۵
امام راغب کی رائے	۵۶
کیا قرآن مجید بغیر سنت کے صحیح معنی میں سمجھ میں آسکتا ہے	۵۹
قرآن میں اتباع رسول کا حکم	۶۰
کتاب و حکمت کا فرق	۶۱
اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کی تفسیر	۶۲
وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس کا مطلب	۶۷
ما آتکم الرسول فخذوہ کے معنی	۶۸
ایتاء اور نہی کی اسناد مجازی ہے یا حقیقی	۶۹
آیات قرآنی کا صحیح مفہوم سنت کے بغیر متعین نہیں ہو سکتا۔	۷۰
حضرت عمران بن حصین کا استدلال	۷۱
بعض دفعہ کلام کی مراد مخاطب کے سوا کوئی دوسرا متعین نہیں کر سکتا	۷۳
قرآن و سنت کا باہمی تعلق	۷۴
دین کا مدار قرآن و سنت دونوں پر ہے۔	۸۲
حدیث کی تشریعی حیثیت	۸۴
اور اس سے غرض	۸۴

ج

مضمون	صفحہ
تدوین حدیث	
عہد نبوت اور تدوین حدیث	۸۸
بعض خاص صحیفے	۹۰
تحریک تدوین حدیث	۹۱
درسِ حدیث	۹۲
عہد بنی عباس میں تدوین	
حدیث کا آغاز	۹۳
کتب حدیث کی ترتیب میں	
اختلاف	۹۴
کتب حدیث میں فرق مراتب	〃
تنقید احادیث	۹۵
وضع حدیث کا فتنہ	
اور اس کا انسداد	
وضاعین حدیث کے مختلف	
طبقے	۹۶
اسباب وضع حدیث	۹۷
عہد صحابہ میں عدم کتابت	
حدیث کی وجوہ	۹۹
قبول حدیث میں صحابہ کی	
احتیاط	۱۰۲
بے تحقیق روایت پر وعید	〃
کثرت روایت سے اجتناب	۱۰۳
حدیث پر شہادت	۱۰۵
طلب حدیث کے لئے سفر	۱۰۹

مضمون	صفحہ
حدیث بیان کرتے وقت	
دہشت اور خوف	۱۰۹
کثرت سے روایت کرنے والے	
صحابہ	۱۱۰
حضرت ابوھریرۃ	
اسلام اور جستجوئے علم	۱۱۲
حضرت ابوہریرہ کے لئے دعائے نبوی	۱۱۳
جلالت علم	۱۱۴
روایات	۱۱۵
کثرت روایت کے اسباب	〃
اجلہ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے	۱۱۶
قوۃ حافظہ	۱۱۸
حدیث کی کتابت	۱۱۹
احتیاط	〃
حق گوئی	۱۲۰
عام تبصرہ	〃
وفات	۱۲۱
حضرت عبداللہ	
بن عباسؓ	۱۲۲
نام و نسب	〃
ابن عباسؓ پر رسول اللہ	
صلی اللہ علیہ وسلم کی	
نظر شفقت و تربیت	۱۲۳
ابن عباس کے لئے دعائے نبوی	〃

مضمون	صفحہ
وفات نبوی کے وقت ابن عباس کی عمر	۱۲۴
علمی کمال	〃
صحابہ میں آپ کی قدر و منزلت	۱۲۶
روایت میں احتیاط	۱۲۸
مرویات کی تعداد	〃
صحابہ سب عادل ہیں	۱۳۰
عدالت سے مراد	۱۳۴
تابعین کا دور	۱۳۷
امام زہری	۱۳۸
کتابت حدیث	۱۳۹
حفظ حدیث	〃
مرویات کی تعداد اور انکا پایہ	۱۴۰
شیوخ	〃
اسناد	۱۴۲
اسناد کی اہمیت	۱۴۴
اسماء الرجال کی تدوین	۱۴۵
حدیث صحیح	۱۴۹
عدالت	〃
عدالت کے اعتبار سے	
طبقات رواۃ	۱۵۱
ضبط	〃
شذوذ	۱۵۲
علت	〃
حدیث حسن	〃

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
امام بخاری		انتقاد بخاری و مسلم	۱۶۳	محدثین کی بے لوث	
نام و نسب	۱۵۴	اصول درایت		خدمات علم و مذہب	۸۱
حفظ حدیث	〃	درایت کی ابتدا عہد صحابہ میں	۱۶۵	امام زہری کا واقعہ	۸۲
طلب حدیث	〃	درایت کے اصول	۱۶۷	حضرت اعمش کا واقعہ	۸۳
تنقید حدیث	۱۵۵	علامہ سمعانی کا بیان	〃	حضرت یحییٰ بن یعمر کا واقعہ	〃
الجامع الصحیح	۱۵۸	شیخ ابو اسحاق شیرازی کا بیان	〃	عبداللہ بن علی کے دربار میں	
تعداد احادیث	۱۵۹	علامہ ابن جوزی کا بیان	۱۶۸	امام اوزاعی کی گفتگو	۸۴
شروط بخاری	〃	ملا علی قاری کے بیان کا خلاصہ	۱۷۰	بعض اور ضروری واقعات	۸۶
امام مسلم	۱۶۱	ظنیت حدیث کی بحث	۱۷۸	----------	
صحیح بخاری و صحیح مسلم کا موازنہ	۱۶۲	----------		ایک خط اور اس کا جواب	۱۸۹

حقوق طبع و اشاعت ندوۃ المصنفین کے لئے محفوظ ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جس طرح کسی شخص کے اعضاء رئیسہ میں فتور پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے تمام جسم متاثر ہوتا ہے معدہ و جگر بیمار ہوتے ہیں تو مریض کا مزاج عادات و خصائل، چہرہ کا رنگ، جسم کی موزونیت یہ سب چیزیں بدل جاتی ہیں۔ دماغ کا توازن خراب اور طبیعت میں ایک خاص قسم کا چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ ٹھیک یہی حال قوموں اور جماعتوں کا ہے کسی قوم کے ارباب علم و فضل اس قوم کے لئے قلب و جگر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس ظاہر ہے اگر یہ تندرست اور قوی ہیں، تو قوم کے افراد میں بھی صحت و تندرستی کے آثار پائے جائیں گے، لیکن اگر بدنصیبی سے ان لوگوں کا ہی حال سقیم ہے، خود ان ہی کے دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے اور ان میں آپس میں یکجہتی و ہم خیالی، ہم مقصدی و ہم آہنگی نہیں ہے، تو پھر غریب افراد کا پوچھنا ہی کیا، وہ اگر ریگ کے ذروں کی طرح منتشر و پریشان ہیں، تو کوئی جائے استعجاب نہیں۔ اور اگر ان کا خاکستر قومیت " دوش ہوا پر جہالت و نادانی کے تیرہ و تار بیابانوں میں آوارہ پھر رہا ہے تو اس پر کوئی حیرت نہیں۔

آہ! کیونکر کہیئے کہ آج مسلمانوں کی قوم کا حال بھی یہی ہے۔ جماعت جس چیز سے جماعت بنتی ہے یعنی احساس مرکزیت وہ سراسر ان میں مفقود ہے۔ ہر شخص ایک نئے خیال کا پابند اور ہر مسلمان ایک نئے

جذبہ و آہنگ سے ہم کنار ہے۔ ایک مرض ہو تو اس کی شکایت کی جائے زخم ایک ہو تو اس کے لئے تدبیر چارہ گری کی جا سکتی ہے، جب جسم ہمہ تن داغ بن گیا ہو تو پنبہ و مرہم کہاں کہاں رکھا جائے۔ دامان و جیب اگر کہیں سے پھٹ گئے ہیں تو انہیں سیا جا سکتا ہے لیکن اگر دستِ وحشت نے ان کو تار تار کر دیا ہے تو پھر کیوں کسی کا احسان سوزن کاری و منتِ بخیہ گری اٹھائیے کہ یہ سب تدبیریں اور چارہ سازیاں لاکھ کوششوں کے بعد بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتیں۔

جماعتی مرکز ہر جماعت کی روح و رواں اس کا مرکز ہوتا ہے۔ جب تک اُس قوم کے افراد میں مرکز سے وابستگی پائی جائے گی ان کی روح سرسبز و شاداب رہے گی۔ اور جتنا جتنا اس وابستگی میں اضمحلال پیدا ہوتا جائے گا، ان کی قومیت بھی مضمحل، کمزور اور از کار رفتہ ہوتی رہے گی۔ یہاں تک کہ اگر یہ احساس مرکزیت بالکل ناپید ہو جائے تو پھر وہ جماعت جماعت نہیں رہتی اس کے افراد تسبیح کے ٹوٹے ہوئے دانوں کی طرح منتشر، اور گریبانِ عاشق کی مانند پراگندہ و متفرق ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی دنیا الگ ہر ایک کا مرکزِ خیال جدا، اور ہر ایک کا کعبۂ مقصود دنیا ہوتا ہے، ان میں جماعتی وحدت مفقود ہو جاتی ہے، اور انفرادی تشتت خیال، ان کے نظامِ جماعت کے شیرازہ کو پریشان کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید کی زبانِ حق ترجمان نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا	اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ایسا کرو گے
فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا	تو تمہاری طاقت سست پڑ جائیگی، اور ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور جیسی
اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ	کچھ بھی مشکلیں مصیبتیں پیش آئیں تم صبر کرو اللہ انکا ساتھی ہے جو صبر کرنیوالے ہیں

اس آیت میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ اگر تم نے اپنے مرکز (اطاعۃ اللہ و رسولہ) سے انحراف کیا تو پامال ہو جاؤ گے۔ تمہاری قومی عظمت و سطوت کا قصر رفیع، دھم سے زمین پر آ رہیگا، اور دوسری قومیں تمہیں ایک لقمۂ تر سمجھ کر ہضم کر جانے کی کوشش کریں گی۔ پھر فرمایا گیا کہ اگر کسی بات پر

تم کو کسی سے اختلاف بھی ہو تو اس پر صبر کرو، ایسا نہ ہو کہ تم اختلاف کے چند شعلوں کو فرط عناد و بغض کے دامن سے ہوا دے کر بن کی آگ بنا دو اور وہ تمہاری قومیت کے جسم و روح کو از فرق تا بقدم بھسم کر کے رکھ دے۔

مسلمانوں کا مرکز مسلمانوں کا مرکز کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں ایک اور صرف ایک ہے، اور وہ قرآن ہے، ان کی تمام عبادات، معاملات، معاشرت، تمدن، تہذیب اور ان کے تمام اجتماعی اور اقتصادی نظام سب اسی ایک مرکز سے وابستہ اور اسی ایک رشتہ سے منسلک ہیں ان کی تمام اخلاقی و روحانی برتریوں اور بزرگیوں کا دار و مدار صرف اسی ایک کتاب مبین کے تعامل پر ہے، انہوں نے اس کی قیادت میں جب کبھی کسی جانب رُخ کیا دشمنوں کی صفیں پہاڑ کی طرح مضبوط تھیں، دم کے دم میں الٹ گئیں اور کفر و شرک کے مضبوط قلعے مفتوح و سرنگوں ہو کر حق و صداقت کا پرچم اڑانے لگے۔ انہوں نے قرآن کی مشعل کو ہاتھ میں لئے ہوئے جس کسی وادیِ پر ظلمت کی جانب اپنے عربی النسل گھوڑوں کی باگیں موڑیں تردد و تذبذب اور شک و شبہ کی تاریکیاں خود بخود چھٹتی چلی گئیں، اور پھر وہاں ایمان و ایقان کے آفتاب جہانتاب نے اس شان سے طلوع کیا کہ ع

عالم تمام مطلع انوار ہو گیا

لیکن جب سے دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر ان کو قرآن حکیم سے بُعد ہونا شروع ہوا ان کی روح قومیت بھی درماندہ ہونے لگی اور آج اس کے جو نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ان کے ماتم میں دیدۂ و دل سے جتنا بھی دجلۂ خون بہے کم ہے اور جس قدر بھی آہ و فغاں کے شرارے لب و دہن سے بلند ہوں تھوڑے ہیں

قرآن مجید کی مرکزیت سے تو کس مسلمان کو انکار ہوگا، مگر مشکل یہ ہے کہ خود قرآن مجید کے فہم کے متعلق اب اس قدر زاویہائے نگاہ پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کی موجودگی میں محض مرکزیت کا اعتراف

مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو دستور اسلامی ماننے کے باوجود مسلمانوں میں پراگندگی خیال، تشتت اعمال، اور انتشار حسیات وجذبات کی وبا عام ہو رہی ہے اور یہی وہ انتشار وافتراق ہے جو ان کو ایک مرکز پر جمع نہیں ہونے دیتا۔

فہم قرآن کی نسبت دو نئے خیال

آج کل قرآن مجید کے فہم کی نسبت دو اہم خیال پائے جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک پر ہم اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں اور ان دونوں خیالوں کا تجزیہ کر کے بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کہاں تک درست اور کس حد تک قابل قبول ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کل ان دونوں نظریوں کی تبلیغ بڑے شد و مد کے ساتھ کی جاری ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اسلام کی تمام بھلائیوں کا دار و مدار اور مسلمانوں کی نجات کا تمام تر انحصار اپنے ہی خاص زاویۂ نگاہ کی نشر و اشاعت پر سمجھ لیا ہے، ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو ان خطرات سے آگاہ کر دیا جائے اور ان کے لئے جو خندقیں کھودی جا رہی ہیں اُن میں اوندھے منہ گرنے سے انہیں بچا لیا جائے۔

قرآن کے آسان ہونے کا غلط مطلب

آپ نے تعلیم جدید کے بعض اصحاب سے سنا ہوگا کہ قرآن مجید ہندوؤں کی آسمانی کتابوں کی طرح مشکل، پیچیدہ اور ناقابل فہم کتاب نہیں ہے جس کا علم و فہم، اور جس کے معانی کا ادراک صرف برہمنوں اور پنڈتوں تک محدود رہتا ہے، بلکہ وہ ایک آسان کتاب ہے جس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور جس کے معانی کا ادراک ہر اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو کسی زبان کا تھوڑا بہت علم رکھتا ہے۔ ان حضرات کا یہ فرمانا بجا اور درست ہے۔ اور وہ کیا خود قرآن مجید نے اپنے آسان ہونے کا اعلان کیا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ — ہم نے قرآن مجید کو ذکر کے لئے آسان کر دیا۔

لیکن اس خیال پر جن کے نتائج کی بنیاد رکھی جاتی ہے اُنکے پیش نظر ہم ان حضرات سے بھی یہی کہہ سکتے ہیں جو حضرت علیؓ نے خوارج کے جواب فرمایا تھا۔ خوارج تحکیم کے خلاف تھے اور اپنے استدلال میں

قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ یعنی حکم تو صرف اللہ ہی کے لئے ہے، علیؓ اور معاویہؓ کو کیا حق ہے کہ غیر اللہ کو اپنے معاملات کے لئے حکم بنائیں" حضرت علیؓ نے یہ سنا تو فرمایا۔

کلمۃُ حق اریدَ بہ الباطلُ   یہ کلمہ حق ہے مگر اس سے باطل کا ارادہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح جو لوگ قرآن کے آسان ہونے کی رٹ لگا رہے ہیں اُن کے الفاظ اگرچہ درست ہیں اور کسی مسلمان کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا، لیکن اگر ذرا اس ادعا کی گہرائیوں میں جائیے تو صاف معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کا مقصد دعوتِ حق نہیں بلکہ ان کے چند خاص اغراض و مقاصد ہیں جنکی تکمیل وہ اس دعوے کی آڑ میں کرنی چاہتے ہیں وہ قرآن کے آسان ہونے کے جو معنی سمجھتے ہیں، اور دوسروں کو بھی باور کرانا چاہتے ہیں وہ ہرگز قرآن کی مراد نہیں ہیں۔ اور نہ وہ کسی صاحبِ انصاف کے نزدیک درخورِ پذیرائی ہو سکتے ہیں۔

قرآن کے آسان ہونے پر چند نتائج کی بنیاد

یہ لوگ قرآن کے آسان ہونے سے حسب ذیل نتائج نکالتے ہیں

(۱) قرآن کے معنی سمجھنے کے لئے کسی خاص علم کا پڑھنا اور حاصل کرنا ضروری نہیں۔

(۲) قرآن سے احکام کا استنباط جس طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کرتے تھے۔ ہم بھی کر سکتے ہیں، اور ہم میں اور دوسرے ائمہ تفسیر میں کوئی فرق نہیں ہے

(۳) اب تک جو تفاسیر لکھی گئی ہیں بیکار ہیں، کیونکہ قرآن تو ایک آسان کتاب ہے اس کے فہم کے لئے کسی علم اور راہنما کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر شخص ترجمہ دیکھکر اس کا مطلب خود بخود معلوم کر سکتا ہے

پھر ان ہی لوگوں میں اب ایک گروہ پیدا ہوا ہے جو ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہتا ہے:۔

(۴) فہم قرآن کے لئے حدیث کی بھی ضرورت نہیں، قرآن ایک مکمل سرچشمۂ ہدایت ہے۔ اسلامی احکام کی تمام کلیات و جزئیات اس میں بیان کر دی گئی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کیا ضرورت

ہے کہ احادیث کی روشنی میں قرآن مجید سے احکام مستنبط کئے جائیں۔

ہر نیا قول جو کسی زمانہ میں کہا جاتا ہے۔ پھر اس کا قائل اسے بار بار دہراتا اور اس پر اصرار شدید بھی کرتا ہے۔ اپنے عہد کے ماحول اور گرد و پیش کی فضاء سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اس بناء پر آیئے اصلی مسئلہ پر بحث و تمحیص کرنے سے قبل یہ معلوم کریں کہ اس طرح کا ادعاء کب سے کیا جا رہا ہے اس کی تاریخ کیا ہے؟ اور اس میں اپنے زمانہ کے کن کن رجحانات و میلانات کا عکس نظر آتا ہے؟ ویسے ظاہر ہے ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر واقعی قرآن مجید ایسا ہی سہل ہے تو صحابہ کرام میں پھر آپ کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں بعض بعض آیات کا مفہوم متعین کرنے میں کیوں اختلاف ہوا، اور اس کی کیا وجہ ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمرؓ ایک چھوٹی سی چھوٹی سورت کو بھی بہت بہت دنوں میں ختم کر سکتے تھے۔ ائمہ کرام اور مفسرین عظام کیا معاذ اللہ عقل باختہ تھے کہ انہوں نے ایک آسان سی بات سمجھنے کے لئے عمریں کی عمریں صرف کر دیں اور پھر بھی اس کا قرار واقعی حق ادا نہیں کر سکے، سوال ہو سکتا ہے کہ اگر آسانیِ قرآن کا ادعاء بایں معنی درست ہے تو اب تک علماء نے جو خون پسینہ ایک کیا وہ سب فضول تھا، اور اگر یہ درست نہیں ہے تو پھر اس ادعاء جدید کا محرک و اصل سبب کیا ہے؟ اور کیوں اس کو بار بار شد و مد کے ساتھ دہرایا جا رہا ہے؟

ادعائے باطل کا اصل سبب اصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان پر اپنے حاکمانہ قبضہ کی گرفت مضبوط کرنی چاہی تو انہیں یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان کی قومیں اور بالخصوص مسلمان کٹر قسم کے مذہبی لوگ ہیں اور اپنے مذہبی تعصب کی بناء پر انگریزوں کی ہر ایک چیز سے نفرت شدید کرتے ہیں اور اس مذہبی جوش کے باعث ان میں جذبۂ جہاد، (Fanaticism) بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انگریز ہندوستان کو فتح کر چکے تھے، لیکن وہ جانتے تھے کہ مسلمان کا جذبۂ جہاد ایک شیر کی طرح ہے کہ جب تک وہ اپنی کچھار میں پڑا سوتا رہتا ہے

کسی چیز کی پروا نہیں کرتا لیکن جب وہ بیدار ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اس کو ترساں و ہراساں نہیں کر سکتی۔ یہی اندیشہ تھا جس نے انگریز کو آتش زیر پا کر رکھا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کوئی ترکیب ایسی چلنی چاہیئے کہ مسلمانوں کے دلوں میں انگریزیت کے خلاف جو جذبۂ نفرت بھرا ہوا ہے وہ جاتا رہے، لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمان علمائے کرام کے زیر اثر تھے۔ اور وہ کسی حالت میں بھی انگریز کی طہارت کا فتویٰ دینے کے لئے تیار نہ تھے اب انہیں محسوس ہوا کہ ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ علمائے کرام کا ہی وجود ہے، اور ایسی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہیں کہ آسانی سے کسی کے نقرئی یا زریں دام فریب میں آسکیں اس بنا پر وہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح علماء کا وقار ختم کر دیا جائے، اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر انہوں نے جو تسلط جما رکھا ہے اس کی گرفت کو ڈھیلا کر دیا جائے۔

یہ اس فکر میں تھے ہی کہ انہیں سرسید اور اُن کے بعض ہم خیال لوگ مل گئے جنہوں نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا اور اس میں اپنے مذہبی مضامین کے ذریعہ غریب علماء کا تو ذکر ہی کیا ہے، سرے سے مذہب کی بساط کہن الٹ کر رکھدی۔ آپ سرسید کے مضامین پڑھیے، ان کے ہم خیال شعراء کی نظمیں دیکھیئے، آپ محسوس کریں گے کہ ان میں کس آزادی کے ساتھ علماء کرام پر آوازے کسے گئے ہیں، کیسی کیسی نادر اور نرالی پھبتیاں ان پر چسپت کی گئی ہیں۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ محض سب و شتم سے کام نہیں چلتا، اس لئے علماء کے وقار کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے ایک اور تدبیر اختیار کی جو شاید پہلی سے زیادہ کامیاب رہی ایک طرف تو انہوں نے کہنا شروع کیا کہ "اَلدِّیْنُ یُسْرٌ" دین تو آسان ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی سہولت و آسانی کے مطابق سمجھ سکتا اور اس پر عمل کر سکتا ہے، اور دوسری طرف انہوں نے کہا کہ حضور خود فرما گئے ہیں۔ انتم اعلم بامور دنیاکم تم اپنی دنیا کی باتوں کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو" پھر کیا

انہوں نے اعلان کیا کہ دین ہے ایسا کونسا پیچیدہ معمہ جس کے حل کرنے کے لئے ابو حنیفہ، یا کسی غزالی و رازی کا دماغ و جانسوزی درکار ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما گئے ہیں۔ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰہَ دَخَلَ الْجَنَّۃَ۔ جس کسی نے لا الٰہ کہہ لیا جنت میں داخل ہو گیا۔

یہ جتنی باتیں کہی گئیں، الفاظ کی حد تک سب درست تھیں۔ لیکن ان الفاظ کے قالب معانی کا جو جامہ چڑھایا گیا، اسلامی تخیل کے نقش سے بالکل معرا اور سادہ تھا۔ اور اس پر جگہ جگہ اغراض فاسدہ کے سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے، اس طرح کی باتیں کہہ کہہ کر مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ دین اور قرآن کوئی مشکل چیز نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ عربی کا عالم ہو یا نہ ہو اسے سمجھ سکتا ہے، اور اس کے احکام معلوم کر سکتا ہے؛ اس لئے علماء کا جو وصف مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے وہ ایک بے بنیاد چیز ہے۔ انگریز اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا، اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو علماء اسلام کی ایک جماعت حقہ سے نفرت دلا کر کس اطمینان خاطر کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔

دراصل یہ ہے تاریخ اس طرح کے پروپیگنڈے کی۔ اور جو کچھ یہ کہا جا رہا ہے کوئی نئی بات نہیں، بلکہ ایک نوائے قدیم کی صدائے بازگشت ہے۔ جو کچھ دنوں کے لئے خاموش ہو گئی تھی مگر اب بعض مصالح کی خاطر سیاست کے حُدی خواں نے پھر اس نغمۂ کارواں کو گانا شروع کر دیا ہے۔

قرآن مجید نے خود اپنے تئیں آسان کہا ہے ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر) اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو سہل کر دیا تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں، تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنیوالا؟

یہ آیت "سورۃ القمر" میں متعدد بار آئی ہے سورۃ کے شروع میں قیامت کا ذکر ہے اور ان لوگوں پر شدید نفرت کا اظہار کیا گیا ہے، جو اپنی خواہشات کی پیروی میں دن رات مشغول رہتے

ہیں اور داعی حق کی آواز کو بالکل نہیں سنتے، پھر علی الترتیب، قوم نوح، عاد، ثمود، اور قوم لوط کی نافرمانی و سرکشی اور قہر الٰہی سے ان کے تباہ و برباد ہو جانے کا بیان الگ الگ ایسے انداز میں کیا گیا ہے، جس کو سن کر سخت سے سخت منکر کا بھی دل لرز جائے اور ہر واقعہ کے ذکر کے بعد بطور تنبیہ دریافت کیا گیا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ (دیکھو، میرا عذاب دینا اور ڈرانا ان کے حق میں کس طرح ہوا)

فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (القمر) (پس کیا کوئی ہے (اس سے) نصیحت حاصل کرنے والا؟)

اور مذکورۂ بالا آیت میں نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کی آسانی اور سہولت کو بیان فرما کر اس سے سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے۔

ایک اور موقع پر سورۂ "مریم" میں ارشاد ہے:-

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا (سورہ مریم) (اور تحقیق ہم نے قرآن مجید کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ تم اس کے ذریعہ پرہیزگاروں کو بشارت سناؤ اور جھگڑالو قوموں کو ڈراؤ دھمکاؤ۔)

قرآن ہدایت و نصیحت کی کتاب ہے

ان دونوں آیتوں کے نفس مطلب اور ان کے سیاق و سباق پر غور کیجئے تو یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی زبان میں، اس کے آسان ہونے کے معنی کیا ہیں؟ پہلی آیت کا سباق اور اس کا ماقبل سے ربط آپ کو معلوم ہو چکا ہے، اس سے صاف طور پر یہی متبادر ہوتا ہے کہ قرآن مجید رشد و ہدایت کی آسان کتاب ہے۔ اس میں عبرت و بصیرت کے لئے جگہ جگہ اقوام کہن کے واقعات کا بیان ہے، اور خدا کے وجود حق کو ثابت کرنے کے لئے قدرت کی ایسی واضح نشانیاں بتائی گئی ہیں جن کا ایک ایک ذرہ مبدأ فیاض کے وجود و ثبوت اور اس کی قدرت بے مثال کا زبان حال سے اعلان کر رہا ہے۔ یہ سب باتیں ان کو قرآن مجید

سے ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے اس عالم کون و فساد میں ہدایت کا سرچشمہ قرآن مجید ہی ہوا۔ تو کیا پھر کوئی ہے جو اس سے موعظت گیر ہو اور نصیحت حاصل کرے؟

پانی کا برسنا، برق کی چمک، رعد کی گرج، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا آفتاب کا مشرق سے طلوع کرنا اور مغرب میں غروب ہو جانا، موسموں کا تغیر و تبدل، انسان کا عدم سے وجود میں آنے کے لئے کن کن مراحل سے گذرنا چشموں کا ابلنا، کھیتوں کا سرسبز و شاداب ہونا، پتھروں سے پانی کا پھوٹ کر نکلنا اور اونٹ کی عجیب و غریب خلقت یہ اور اسی طرح کی وہ سیکڑوں نشانیاں جو قرآنِ مجید میں مذکور ہیں۔ ایک انسان بار بار انکو دیکھتا ہے، لیکن اس کا ذہن ان کے صانع و خالق کی طرف منتقل نہیں ہوتا، قرآن حکیم انتہائی فصیح و بلیغ پیرایۂ بیان میں ان کا ذکر کرتا ہے، اور لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ان سب چیزوں کے اصل منشا اور باعث اور ان کی علت فاعلہ پر غور کریں۔ ظاہر ہے یہ چیزیں مشاہدات سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان کا دیکھنا سمجھنا ان سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا، چنداں مشکل و دشوار نہیں ہے، صرف ضرورت اس کی ہے کہ آدمی اس کی طرف متوجہ ہو۔ پس اسی بنا پر قرآن مجید نے اپنے تئیں آسان کہا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یسّر قرآن کا ذکر کر کے للذکر یعنی نصیحت کے لئے فرمایا گیا، اور پھر ارشاد ہوا فھل من مدّکر؟

چنانچہ مفتی محمد عبدہ المصری بیان کرتے ہیں۔

تفسیر کے چند مراتب ہیں، ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اجمالاً وہ چیز بیان کر دی جائے جو قلب کو اللہ کی عظمت اور اس کے تقدس سے پُر کر دے، اور نفس کو شر سے روک کر خیر کی طرف لے آئے۔ اور یہی وہ بات ہے جس کی بناء پر حکم، "ولقد یسّرنا القرآن للذکر فھل من مدّکر" ،، قرآن مجید کو ہم نے آسان کیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص تفسیر کا مرتبۂ علیا حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ بغیر چند امور کے حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری آیت جو اوپر نقل ہوئی ہے اس کا مفہوم بھی یہی ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے

لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَ ہم نے قرآن کو اس لئے آسان کیا ہے کہ آپ اس کے ذریعہ پرہیزگاروں کو

تُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا (مریم) خوشخبری سنائیں اور جھگڑالو لوگوں کو ڈرائیں۔

مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید میں ترغیب و ترہیب سے متعلق جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ اس قدر صاف واضح اور روشن ہیں کہ وہ لوگ جن کے دل میں عناد و تعصب کے شعلے نہیں بھڑک رہے ہیں، ان کو سن کر شاد کام فلاح ہو جائیں گے۔ اور جو فرط عداوت سے انکار و جحود کی قسم کھا بیٹھے ہیں ان کو قرآن کی آیات وعید سن کر متنبہ ہوگا اور وہ سمجھیں گے کہ جو قادر مطلق عاد و ثمود کی سرکش قوموں کو صفحۂ ہستی سے بے نام و نشان کر سکتا، اور قوم لوط پر پتھروں کی بارش کر کے انہیں مسمار کر سکتا ہے، وہ ان سرکشوں کے ساتھ بھی اگر چاہے تو یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

قرآن کی تعلیمات کا سہل ہونا اب یہ معلوم کرنا دشوار نہیں ہے کہ قرآن مجید کے سہل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تعلیمات آسان ہیں، وہ جن حقائق کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے وہ فلسفہ کے اصول موضوعہ کی طرح مخفی نہیں، بلکہ ہر ایک پر واضح ہیں۔ پھر ان پر عمل کرنا بھی دشوار نہیں۔ کیونکہ قرآن کی راہ اصل فطرت کی راہ ہے اور اس کی روش وہی ہے، جس کی طرف ہر انسان کی فطرت سلیمہ دعوت دیتی ہے۔

جہاں تک قرآن مجید کی نفس تعلیم کا تعلق ہے وہ بے شبہ اس قدر آسان ہے کہ ہر شخص خواہ عالم ہو یا غیر عالم، عربی ہو یا عجمی اُن کو معلوم کر سکتا ہے۔ مثلاً نماز پڑھو، روزہ رکھو حج کرو، والدین اور اعزا و اقربا کے ساتھ احسان و کرم کا معاملہ کرو، شراب نہ پیو، زنا سے بچو، وعدہ پورا کرو، بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ۔ یہ وہ احکام ہیں جن کو ایک عربی داں جس طرح سمجھ سکتا ہے ایک غیر عربی داں بھی اردو یا کسی اور زبان میں ترجمہ دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے۔

فہم قرآن سے مراد لیکن سوال یہ ہے کہ "فہم قرآن" کے معنی کیا یہی ہیں کہ قرآن مجید کو پڑھ کر بعض چیزوں کے متعلق حسن و قبح کے احکام معلوم ہو جائیں اور بس۔ اگر واقعی یہی مراد ہے تو پھر ہمیں اختلاف کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر ظاہر ہے یہ مراد نہیں ہے، بلکہ فہم قرآن سے غرض یہ ہے کہ انسان مجتہدانہ طور سے احکام کا استنباط کر سکے، قرآن کی کسی آیت کو پڑھ کر اس کے واقعات اور حقیقی مفہوم کو متعین کر سکے اس کے معیار بلاغت کو دریافت کر کے یہ سمجھ سکے کہ یہاں کلام کا مقتضیٰ حال کیا ہے اور کس چیز پر زیادہ زور دینا منظور ہے، اس کا مدلول مطابقی اور مدلول التزامی کیا ہے۔ اور یہاں کیا مراد ہے، تو یہ بات یقینی ہے کہ اس مراد و غرض کے اعتبار سے فہم قرآن کسی ترجمہ کے دیکھ لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے خاص خاص شرائط و آداب ہیں کہ جب تک وہ نہ پائے جائیں، کوئی شخص فہم قرآن کا مدعی نہیں ہو سکتا۔

فہم قرآن کی پہلی شرط عربیت کا ذوق ان شرائط میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری شرط عربیت کا ذوق کامل ہے یہ ذوق صرف مقامات حریری، دیوان متنبی اور دیوان حماسہ یا ایم اے عربی کورس پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ایک مدت دراز درکار ہے۔ ذوق سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو عربی کلام پڑھتے وقت وہی لذت و سرور حاصل ہو جو اس کو خود اپنی زبان کا اچھا شعر سن کر حاصل ہوتا ہے، وہ عربی کے تمام محاورات، ان کے مواقع استعمال سے پورا واقف ہو۔ ایک مفہوم کو مختلف طریقہائے بیان سے ادا کیا جا سکتا ہے، وہ جانتا ہے کہ ایک طریقہ کو دوسرے طریقہ بیان پر کیا تفوق حاصل ہے۔ فرض کیجئے ایک جملہ تین لفظوں سے مرکب ہے۔ زید، آیا اور آج، ہر صاحب ذوق جانتا ہے کہ ان میں ترتیب بدل دیجئے تو جملہ کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ ذوق سے غرض یہ ہے کہ وہ ان باریک باریک فروق سے بھی واقف ہو۔

بعض اوقات کسی کلام میں کوئی لفظ محذوف ہوتا ہے اور اس بنا پر مختلف معنی مراد لئے

جا سکتے ہیں، لیکن اہل زبان کے نزدیک اس کا صرف ایک ہی مفہوم ہو سکتا ہے اور وہاں وہی مراد ہوتا ہے۔

ایک دلچسپ واقعہ | حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا واقعہ ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ اپنے کسی پشاوری مرید سے جس کو دہلی میں رہتے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ فرمایا "میاں ذرا صراحی اٹھا لانا اور دیکھنا پیٹ پکڑ کر اٹھانا"، مرید نے ایک ہاتھ سے صراحی کی گردن پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پیٹ پکڑ لیا اور اس شان سے صراحی حضرت اقدس کے سامنے لا کر رکھ دی۔ حضرت مرزا صاحب کے فقرہ بالا میں "صراحی کا" لفظ محذوف ہے، اور مطلب یہ ہے کہ صراحی کا پیٹ پکڑ کر اٹھانا، جو لوگ زبان کا ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہاں صراحی کا لفظ محذوف ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اگر اس کو ذکر کر دیا جاتا تو لطف کلام جاتا رہا۔

اب خیال فرمائیے اگر وہ پشاوری مرید اپنے استدلال میں یہ کہتا کہ آپ نے صرف پیٹ کہا تھا، یہ نہیں بتایا کہ کس کا؟ صراحی کا یا میرا اپنا۔ اس بناء پر دونوں مفہوم مراد ہو سکتے تھے۔ پس اگر میں نے ان میں سے ایک کو متعین کر لیا تو اس میں میری کیا خطا ہے۔ تو بتائیے آپ اس پشاوری مرید کے استدلال کا کوئی منطقی جواب دے سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ آپ کے پاس بجز اس کے کوئی جواب نہ تھا کہ آپ اس کو دہلی یا لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کا حوالہ دیتے اور کہتے کسی زبان داں سے پوچھو اس طرح کا جملہ بولتے ہیں تو وہاں پیٹ سے مراد اپنا پیٹ ہوتا ہے یا صراحی کا؟

زبان دانی | اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک لفظ بولا جاتا ہے لیکن کسی خاص موقع پر اس سے مراد اس کے اصل معنی نہیں ہوتے بلکہ اس کے برخلاف اس کی ضد مراد ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ایک مریض کے پاس اس کی عیادت کے لئے جائیے اور پوچھیئے، کیا حال ہے؟ مریض جواب میں کہتا ہے۔ "اچھا ہوں"

اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں کہ اس جملہ کے دو متضاد مفہوم ہو سکتے ہیں فرق صرف لب و لہجہ کا ہے۔ اگر مریض نے بیماری کی درازی اور صحت سے مایوسی کے عالم میں حسرت آمیز لہجہ سے "اچھا ہوں" کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اچھا نہیں ہوں۔ اس وقت مریض کا یہ اچھا کہنا شعر ذیل کا مصداق ہے۔

پوچھنے والوں نے میرا ناک میں دم کر دیا　　　جس نے پوچھا حالِ دل کہنا پڑا کچھ بھی نہیں

اور اگر بیمار نے انبساطِ خاطر کے ساتھ اپنے تئیں اچھا کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی وہ اب اچھا ہے۔

بسا اوقات جملہ استفہامیہ بولا جاتا ہے، اور اس سے غرض کسی شے کے متعلق کچھ دریافت کرنا بھی ہو سکتا ہے اور استفہام انکاری کے طور پر کسی سے انکار کرنا یا بطور استفہام اقراری کسی بات کا اقرار کرنا بھی مراد ہو سکتا ہے، لیکن ایک شخص جو زبان کے ذوق سے بہرۂ وافر رکھتا ہے اس جملہ کو سنتے ہی معلوم کر لیتا ہے کہ یہاں متکلم کی مراد کیا ہے

ہر کلام کا صحیح مفہوم ایک ہی ہوتا ہے

علماء بلاغت نے اسی بناء پر سچ کہا ہے کہ الفاظ میں ترادف ہے ہی نہیں اور ایک کلام کا مطلب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، غیر زبان داں طرح طرح کی تاویلیں اور دور از کار توجیہیں کرتا ہے لیکن صحیح مخاطب جب اس کلام کو سنتا ہے تو فوراً ایک ہی مفہوم متعین کر لیتا ہے اور اس کی توجیہات مختلفہ کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

بلاغت کے مختلف مدارج و مراتب

یہاں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ بلاغت کے مدارج و مراتب لامحدود ہیں یعنی کسی کلام کے متعلق یہ دعوی نہیں کیا جا سکتا کہ اس پر بلاغت ختم ہے، کیونکہ بلاغت کی تعریف ہے کلام کا مقتضئ حال کے مطابق ہونا، اور ذرا

ذرا سے فرق سے حال اور مقتضیٰ حال کی مطابقت کی اس قدر قسمیں پیدا ہوتی ہیں کہ ان کا کوئی شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ فلسفۂ اخلاق میں کسی قوت کے اعتدال سے جو ملکہ پیدا ہوتا ہے فضیلت کہلاتا ہے اور اس کے برخلاف قوت کی افراط یا تفریط سے جو ملکات پیدا ہوتے ہیں رذائل کہلاتے ہیں لیکن کسی ملکہ کا اچھا یا برا ہونا ایک دوسرے کے اعتبار سے ہی متصور ہو سکتا ہے۔ درحقیقت اس کے اقسام کی تحدید و تعیین نہیں کی جا سکتی۔ تھوڑے تھوڑے فرق و امتیاز سے اور قوت اعتدال کی کمی و بیشی کے لحاظ سے جس طرح رذائل بے شمار نکل آتے ہیں فضائل بھی ان کے بالمقابل لاتعداد پیدا ہو جاتے ہیں، ٹھیک یہی حال بلاغت کے مدارج و مراتب کا ہے ایک کلام خواہ کتنی ہی بلاغت رکھتا ہو، کسی دوسرے کلام سے کمتر ہو سکتا ہے، ایک طرف بلاغت کے مدارج کا لامحدود ہونا پیش نظر رکھیئے اور دوسری طرف علماء بلاغت کا یہ فیصلہ دیکھیے کہ قرآن بلاغت کے اس انتہائی مرتبہ کو حاوی ہے جو کسی کلام کے لئے انتہائی سے انتہائی مرتبہ ہو سکتا ہے

اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ عربیت کے ذوق صحیح سے مراد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ ائمۂ عرب کے کلام کی مزاولت و ممارست سے ایک ایسا پختہ ذوق پیدا ہو جائے کہ وہ عربی کلام کے مدلول و منطوق کو پورے طور پر سمجھ سکے، اس کے اشارات و کنایات سے واقف ہو، الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کر سکے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کو فصیح و بلیغ کلام سن کر حقیقۃً حظ آئے، اور بُرے کلام سے اس کے ذوق کو صدمہ پہنچے۔ مومن کا یہ شعر مشہور ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہم اور آپ اس کو پڑھتے ہیں اور بقدر ذوق اس سے لطف بھی اٹھاتے ہیں، لیکن مرزا غالب نے اس کو سنا تو بیتاب ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان ہی دینے پر آمادگی کا اظہار کرنے لگے۔ پس یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص کا ذوق جتنا زیادہ لطیف و پاکیزہ ہو گا

اسی قدر وہ کلام بلیغ سے محظوظ و شاد کام ہوگا، اور اس کو اس میں زیادہ سے زیادہ باریکیاں نظر آئیں گی۔

اس طرح کا ذوق عربیت سالہا سال کی عرق ریزی، محنت و کاوش عمیق و وسیع مطالعہ اور بہترین دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے کارآمد بنانے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے اور چونکہ قرآن مجید بلاغت کے مرتبۂ قصوٰی پر حاوی ہے، اس لئے کوئی شخص بجز ان بزرگان کرام کے جن کو خود صاحب قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مشکوٰۃ نبوت سے منور کیا ہو دعوے کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی آیت کا مطلب وہی ہے جو اس نے سمجھا ہے۔

آج ہر شخص کو زبان و قلم کی آزادی حاصل ہے جو جی میں آتا ہے کہہ گذرتا ہے اور اس کو اپنی طباعی اور جودت قلم کی داد لینے کے لئے سب سے زیادہ آسان قرآن مجید ہی نظر آتا ہے۔ لیکن جو چیز آج سب سے زیادہ سہل ہے، کل علمار حق کے لئے سب سے زیادہ مشکل اور احتیاط طلب تھی۔

تفسیر قرآن میں اسلاف کی احتیاط

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں "میں نے فقہائے مدینہ کو دیکھا کہ تفسیر قرآن کے باب میں حد سے زیادہ احتیاط برتتے تھے۔ ان میں سالم بن عبداللہ قاسم بن محمد، سعید بن المسیب اور نافع خاص طور پر قابل ذکر ہیں

حضرت شعبیؒ فرماتے تھے: "تین چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق میں مرتے دم تک کچھ نہیں کہہ سکتا قرآن، روح، اور قیاس"[1]

اصمعی کو سب جانتے ہیں عربی لغت و ادب کا کتنا بڑا امام ہے، برسوں تحقیق لغات اور صحیح محاورات اور ان کے معانی کی فکر میں عرب کے جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا ہے اور لفظ لفظ کے لئے عرب کے بدوؤں میں برسوں تک قیام کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر میں

[1] ابن جریر ج ۱ ص ۲۹

بالکل خاموش رہتا تھا۔ اس سے قرآن مجید کی کسی آیت کی نسبت دریافت کیا جاتا تو کہتا: "عرب اس کے یہ معنی بیان کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا اس سے مراد کیا ہے"[1]؟

ابو الطیب کہتا ہے۔ "اصمعی سخت خدا پرست تھا۔ وہ قرآن کی کسی آیت کی تفسیر نہ کرتا تھا"

ان اکابر علم و ادب کی یہ احتیاط کوشی دیکھیے اور اس کے بالمقابل آج کل کے ایک خود غلط گریجویٹ کا ادعا ملاحظہ فرمائیے۔

"آج ایک گریجویٹ کو عربی ادب سے واقف کر کے دو سال بطور خود اسلامی مذہبی علوم کا مطالعہ کرنے کے لئے چھوڑ دو اگرچہ وہ آپ کی طرح علم و تقویٰ کا مدعی تو نہیں ہو گا لیکن وہ اسلام کو ہزار درجہ اُس قابل عربی داں سے بہتر سمجھے گا۔ جس نے ابتدا میں قال اقول سے سر مارا اور آخر میں قال رسول اللہ سے"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"مذہب اسلام سمجھنے کے لئے فلسفۂ مذہب، تاریخ مذہب، اقوام سامیہ کا لٹریچر، تاریخ انقلاب و علم انساب کی ضرورت ہے جو دیوبند یا ندوہ کی دسترس سے باہر ہے۔ مگر جو ایک انگریزی داں کے لئے معمولی بات ہے"

دنیوی امور میں ماہرین کی طرف مراجعت کی جاتی ہے

جو لوگ دین کے معاملہ میں اس درجہ متساہل واقع ہوئے ہیں غور کریں دنیوی معاملات میں خود ان کی تقلید کا کیا عالم ہے آپ کسی شخص کو اس وقت تک ڈاکٹر تسلیم نہیں کرتے جب تک اس نے باقاعدہ کسی اسکول یا کالج میں ڈاکٹری کا کورس پورا نہ کیا ہو کسی شخص کے قانونی مشورہ کو اُس وقت تک درخور اعتنا نہیں سمجھتے جب تک اُس نے باقاعدہ وکالت یا بیرسٹری کا امتحان پاس نہ کیا ہو۔ پھر ڈگری کی حیثیت کے اعتبار

---

[1] المزہر ج ۲ ص ۲۰۴

سے ڈگری یافتہ کے اعزاز واکرام میں بھی فرق مراتب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، ہندوستان کے ایم بی بی ایس یا ایل ایل بی کے قول کا وہ وزن نہیں ہوتا جو انگلینڈ کی کسی طبی ڈگری یا بیرسٹری کے ڈپلومے والے کا ہوتا ہے۔ "نیم حکیم" کے قول کو آپ ہمیشہ "خطرۂ جان" سمجھتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ دین کے معاملہ میں آپ "نیم مولوی" کے فتوے کو "خطرۂ ایمان" قرار نہیں دیتے۔ ترجمہ کی مدد یا عربی کی معمولی شُدبُد حاصل کر لینے سے کسی کو یہ حق ہرگز نہیں پہونچتا کہ وہ مدعیانہ رنگ میں ان لوگوں کے مقابل آئے، جنہوں نے اپنی عمریں ان ہی علوم اسلامیہ کی خدمت میں بسر کی ہیں، اور جنہوں نے اپنی زندگی کی تمام راحتوں اور آسایشوں کو برباد کر کے قرآنی حقائق ومعانی کی چھان بین میں خون پسینہ ایک کیا ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سائل کی حیثیت سے اپنے شکوک وشبہات کو علمائے کرام کے سامنے پیش کریں اور ان سے جواب کے طالب ہوں، لیکن آپ کے لئے یہ کبھی جائز نہیں ہو سکتا کہ چند مخصوص خیالات کو ذہن میں رکھ کر عربیت سے بالکل ناواقف ہونے کے باوصف آپ مجتہدانہ انداز میں کلام کرنے کی جسارت کریں، اور جس امام کی بات آپ کے خیال کے مطابق نہ ہو آپ اُس پر بے تکلف تبرا شروع کر دیں بس آپ کے لئے دو صورتوں کے سوا کوئی اور تیسری صورت نہیں ہے یا خود عربیت کا ذوق پیدا کیجئے۔ علوم اسلامیہ کی تکمیل کر کے اُن میں بصیرت ونظر حاصل کیجئے اور اگر یہ نہیں ہے تو ائمۂ اسلام پر اعتماد کیجیے اور ان کی بات مانیے۔ آج ہر وہ شخص جو فہم قرآن کا مدعی ہے اس کو بتانا چاہیئے کہ وہ کہاں تک اس دعوی کا اہل ہے۔ قرآن بیشک آسان ہے، لیکن کسی شے کے آسان ہونے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس کے سمجھنے کے لئے نہ اس کے مبادی جاننے کی ضرورت ہے اور نہ اس کے لئے کچھ اصول موضوعہ ہیں جن کو سمجھنا اور جن پر غور کرنا ضروری ہو۔

دو اماموں کی رائے امام ابوبکر الباقلانی فرماتے ہیں:۔

من زعم انہ یمکنہ ان یفہم	جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ خود بلاغت
شیئاً من بلاغۃ القرآن	کی مشق و ممارست کئے بغیر قرآن مجید کی
بلا ون ان یمارس البلاغۃ	بلاغت کو تھوڑا بہت سمجھ سکتا ہے،
بنفسہ فھو کاذب مبطل[1]	وہ جھوٹا اور باطل گو ہے۔

امام موصوف نے تو صرف بلاغت قرآن تک ہی بات محدود رکھی ہے، علامہ سید رشید رضا نے تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ عربیت کے بغیر کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت پذیر بھی نہیں ہو سکتا، کہتے ہیں:-

لا یتعظ الانسان بالقرآن فیتطمئن	کوئی شخص قرآن مجید سے نصیحت پذیر نہیں ہو سکتا بایں معنی کہ
نفسہ بوعدہ وتخشع لوعیدہ	کہ اس کا نفس قرآنی وعدوں پر مطمئن ہو جائے اور وعید سے لرز
الا اذا عرف معانیہ وذاق حلاوۃ	جائے جب تک کہ وہ اس کے معانی کو سمجھنے کی اہلیت پیدا نہیں
اسالیبہ	کر لیتا اور اس کے طریقہائے بیان کی شیرینی محسوس کرنے نہیں لگتا۔

امام مالکؒ فرماتے تھے۔ "مجھے اس شخص پر حیرت ہوتی ہے، جو لغت عرب میں مہارت نہ رکھنے کے باوجود قرآن مجید کی تفسیر کرنے کی جرأت کرتا ہے"

مجاہدؒ کا مقولہ ہے "جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب کے متعلق کلام کرے۔ اگر وہ لغات عرب کو نہیں جانتا۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا "جو شخص عربیت سے ناواقف ہے وہ بسا اوقات ایک آیت پڑھتا ہے اور اس طرح کسی لفظ کو پڑھتا ہے کہ وہ اس کے لئے باعث ہلاکت بنجاتا ہے۔

قرآن مجید نے اپنی نسبت آسان ہونے کا دعوی کیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس نے

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن ۱۲

خود علم کے اعتبار سے لوگوں میں تفریق کی ہے۔ ارشاد ہے :-

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ اس کو وہی لوگ جانتے ہیں جو احکام کا استنباط کر سکتے ہیں دیکھیے جہاں تک نصیحت حاصل کرنے کا تعلق ہے صاف طور پر فرمایا جاتا ہے۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ" کسی عالم و غیر عالم کی تخصیص نہیں کی جاتی۔ لیکن جب اس کے علم کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسے ان لوگوں کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا ہے جو مفہوم کلام پر پورے طور سے حاوی ہو کر احکام کا استنباط کر سکیں۔ اور ظاہر ہے یہ سلیقہ ذوقِ عربیت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

کسی زبان کے ادب و بلاغت کا ذوق ایک نعمت خداداد ہے، تاہم اس کے استوار ہونے میں اس زبان کے علوم صرف و نحو، معانی و بلاغت سے بڑی مدد ملتی ہے۔ جب تک اسلام عرب میں محدود رہا اس وقت تک علوم عربیہ میں سے نہ کوئی علم و فن مدوّن ہوا تھا اور نہ کسی علم کی ضرورت تھی۔ قواعد زبان سے بنتے ہیں نہ کہ زبان قواعد سے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد صحابہ میں قرآن مجید کی تفسیر کے متعلق اختلاف بہت کم نظر آتا ہے۔ لیکن جب قرآن کی اشاعت عربی زبان نہ جاننے والے ملکوں میں ہوئی، اور وہ لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے تو اب ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کو قرآن فہمی کے قابل بنانے کے لئے عربیت کے علوم و فنون کو مدون کیا جائے چنانچہ صرف و نحو اور دوسرے علوم کی تدوین عمل میں آئی۔

غور کرنا چاہیئے، جب تک معاملہ اہل زبان تک محدود رہا۔ کسی علم و فن کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن جب ان سے گذر کر عجمی اقوام تک اس کی رسائی ہوئی تو محض قرآن مجید کو صحیح پڑھنے اور اس کو سمجھ سکنے کے لئے ان تمام علوم و فنون عربیہ کی داغ بیل پڑی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کوئی شخص عربیت کے تمام علوم جن کی تعداد علماء نے چودہ لکھی ہے بدرجۂ کامل حاصل نہیں کرے گا۔ اسے حق نہیں ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے متعلق اپنی ذاتی رائے

پیش کرسکے اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ خود مریض ہے تو اطباء پر اعتماد کرے اور ان ہی کے تجویز کئے ہوئے نسخہ کو اپنے لئے پیغام شفا سمجھے۔

یہاں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اس کے لئے صرف عربی زبان وادب پر عبور حاصل کرلینا ہی کافی نہیں، بلکہ اس سلسلہ میں الفاظ مفردہ جو قرآن مجید میں آئے ہیں ان کے حقائق سے پورے طور پر باخبر رہنا ضروری ہے یعنی ان الفاظ کے لغوی معانی سے گذر کر معلوم کرنا چاہیئے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں یہ الفاظ کن معانی میں استعمال ہوتے تھے، مثلاً تاویل کا لفظ ہے کہ نزول قرآن کے بہت بعد تفسیر کے معنی میں بولا جانے لگا لیکن خود قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں نہیں آیا ہے۔ مثلاً آیت ذیل میں

ھل ینظرون الا تاویلہٗ یوم یاتی	کیا یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ فساد و بدعملی کے جس
تاویلہ یقول الذین نسوہ من قبل	نتیجہ کی اس میں خبر دی گئی ہے اس کا مطلب وقوع میں آجائے
قد جاءت رسل ربنا بالحق	جس دن اس کا مطلب وقوع میں آئے گا اس دن وہ کہ اسے پہلے
.. .. (الاعراف)	سے بھول گئے تھے کہیں گے بے شبہ ہمارے پاس ہمارے رب
.. ..	کے رسول حق بات لیکر آئے تھے۔

کتنے ہی لفظ ہیں جن کے معنی نزول قرآن کے وقت کچھ اور تھے۔ اور دو ایک صدیوں کے بعد وہ کسی اور معنی میں مستعمل ہونے لگے۔ پس جو شخص فہم قرآن کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کے کسی لفظ سے وہی معنی مراد لے جو عہد نبوت میں اس سے مراد لئے جاتے تھے۔

دوسری شرط ان علوم رسمیہ میں کمال حاصل کرنے کے ساتھ دوسری چیز جو قرآن کے مطالب کو بصیرت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہے، وہ نور بصیرت ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسے "ذوق قرآنی" کہہ سکتے ہیں۔ ایک قرآن پر ہی کیا موقوف ہے، دنیا کا کوئی علم وفن ایسا نہیں

ہے جس میں کمال اور مجتہدانہ نظر پیدا کرنے کے لئے عام فطانت و ذکاوت کے علاوہ اس علم کے ساتھ ایک فطری لگاؤ ضروری نہ ہو۔ علی گڈھ سے ہزاروں نے بی اے اور ایم اے کا امتحان پاس کیا، لیکن محمد علی مرحوم کی طرح انگریزی کے بہترین ادیب کتنے پیدا ہوئے۔ دیوبند نے ہزاروں علماء کو سند فراغت تقسیم کی۔ لیکن ان میں ایسے کتنے ہیں جو حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہؒ کی سی نظر بصیرت رکھتے ہوں۔

'حقیقت یہ ہے کہ جب کسی انسان کو کسی خاص فن کے ساتھ دلچسپی ہوتی ہے تو اس کی نظر اس فن کے مسائل کے لئے ایک بیگانہ کی نہیں بلکہ آشنائے دیرینہ کی نظر ہوتی ہے، زندگی کے ہر شعبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کام میں کامیابی کا مدار ایک بڑی حد تک اس سے دلچسپی اور فطری لگاؤ پر ہوتا ہے۔ ڈاکٹری کا اعلیٰ سے اعلیٰ امتحان پاس کرنے والے کیا سب ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ پھر بیرسٹری کی ڈگری رکھنے والے کیا حذاقت فن اور کمال پیشہ اور مہارت قانون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے؟

یہ چیز مزید بحث و نظر کی محتاج نہیں ہے، ہر شخص بداہۃً اس کو جانتا ہے، مگر کیا کیجئے۔ اس زمانہ میں جس طرح بعض پرانی نظری باتیں بدیہی بن گئی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض بالکل بدیہی اور مسلّم حقیقتیں بھی نظر و فکر کے حجاب میں پوشیدہ ہوتی جارہی ہیں۔

کسی فن کے ساتھ یہ فطری لگاؤ اور اس کا ذوق صحیح بالکل خداداد بات ہے۔ یہ نعمت ہر ایک شخص کے حصہ میں نہیں آسکتی۔ اس بنا پر اگر ہم اس فن کے کسی ماہر خصوصی کی طرف نسبت کرکے یوں کہہ دیں کہ ہر شخص اس جیسا نہیں ہوسکتا تو کوئی شبہ نہیں کہ ہمارا یہ کہنا بالکل درست اور بجا ہوگا۔ اسی طرح ہم اگر یوں کہیں کہ قرآن مجید کو ہر شخص حضرت ابن عباسؓ یا حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی طرح نہیں سمجھ سکتا تو اہل انصاف جانتے ہیں ہمارا یہ سراسر حق ہے، کوئی شخص

اس کی تکذیب نہیں کرسکتا، اب اس حقیقت کو پیش نظر رکھیئے اور دیکھیے یہی برخود غلط گریجویٹ کس قدر مضحکہ انگیز بات کہتا ہے۔

"قرآن سب سے زیادہ آسان کتاب ہے، نہ یہ مابعد الطبیعۃ کا فلسفہ ہے نہ ریاضی کی کتاب کہ اس کے لئے تحقیق کی جائے، انسان جس کو خدا نے دو آنکھیں اور دو کان اور ایک صحیح دماغ دیا ہے، وہ قرآن کے سمجھنے کا اتنا ہی اہل ہے جتنا کہ ایک علامۃ اللوذعی قرآن کے سارے احکام پر ہمارا عمل ہونا چاہیئے، نہ اس میں کسی تاویل کی ضرورت اور نہ کسی تفسیر کی"

اس تقریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فہم قرآن کے لئے اولین طور پر دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک علوم عربیہ کی مہارت اور دوسرا ذوق قرآنی۔ پہلی چیز کسبی ہے اور دوسری وہبی جس طرح کوئی شخص شعر و ادب کے فطری ذوق کے بغیر شاعر و ادیب نہیں ہوسکتا۔ ٹھیک اسی طرح "ذوق قرآنی" کے بغیر فہم قرآن کا اہل بھی نہیں ہوسکتا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

علامہ سید رشید رضا نے اسی حقیقت کو اس طریقہ پر بیان کیا ہے:۔

"وہ حق جس کے اندر کوئی شک و شبہ نہیں ہوسکتا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تمام قرآن لوگوں تک پہنچا دیا۔ جو آپ پر نازل ہوا تھا۔ اور اس کو آپ نے وضاحت کے ساتھ بیان بھی کر دیا۔ آپ نے علم دین کی کسی شے کے ساتھ کسی کو مخصوص نہیں کیا ہے اور نہ علم دین میں کسی کو کسی پر کوئی فوقیت ہوسکتی ہے، البتہ صرف فہم قرآن کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جاسکتی ہے، اور یہ فہم قرآن دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک ان میں سے کسبی ہے، دوسری وہبی۔ کسبی تو یہ ہے کہ آدمی علم السنت

آثار علماء، صحابہ، تابعین، اور صدر اول میں جو علماء امصار تھے ان کے اقوال اور مفردات لغت اور اس کے اصالیب وطُرُق اور اسی طرح دوسرے علوم وفنون ہیں مثلاً علم فطرت، تاریخ عالم، نفسیاتِ انسان۔ ان سب علوم سے قرآن کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور یہ سب علوم مکتسبہ ہیں جو کوشش اور جد وجہد سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اور دوسری قسم وہبی ہے۔ اور یہ وہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ "فہم قرآن ایک خاص نعمت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے خاص خاص بندوں کو ہی نوازتا ہے" اور اس قسم ثانی کی وجہ سے ہی علوم کسبیہ میں مہارت رکھنے والے علماء ایک دوسرے پر باہمی فضیلت وبرتری رکھتے ہیں۔ مگر جو شخص علم عربیت سے ناآشنا اور سُنَن وآثار سے ناواقف ہے اس کو علم وہبی سے بھی کوئی حصہ نہیں ملتا ہے، کیونکہ علم کسبی تو اصل ہے جو علم وہبی کو بطور نتیجہ پیدا کرتا ہے"

سب صحابہ فہم قرآن میں برابر نہیں تھے

ہم عجمیوں اور خیر القرون سے اس قدر بُعد رکھنے والوں کا کیا ذکر؟ خود صحابۂ کرام جو بلا واسطۂ غیرے نبوت کی زبان حق ترجمان سے قرآن مجید سنتے تھے اور جن کے سینے آفتاب رسالت کی روشنی سے روشن ہو رہے تھے فہم قرآن میں ہمرتبہ نہیں تھے۔ تمام صحابہ میں صرف چھ یا سات تھے جو قرآنی حقائق کی توضیح میں مستند مانے جاتے تھے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

مسروقؒ فرماتے ہیں

شاممت اصحاب رسول اللہ	میں نے صحابہ کرام سے فیض صحبت اٹھایا تو میں نے دیکھا کہ
فوجدت علمہم انتہی الی ستۃ	ان کا علم چھ بزرگوں کی طرف لوٹتا ہے۔ حضرت عمر، حضرت
الی عمر و علی و عبد اللہ و معاذ	علی، عبداللہ بن مسعود، معاذ، اور ابوالدرداء، اور زید
وابی الدرداء و زید بن ثابت[1]	بن ثابت۔

پھر یہ چھ یا سات بھی فہم قرآن میں یکساں نہیں تھے۔ حضرت مسروق اسی روایت میں آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

فشاممت ھؤلاء الستۃ فوجدت	میں نے پھر ان چھ بزرگوں سے شرف صحبت حاصل کیا تو
علمہم انتہی الی علی و عبد اللہ	دیکھا کہ ان سب کا علم علی اور عبداللہ پر ختم ہوگیا ہے

یزید بن عمیرۃ السکسکی حضرت معاذ بن جبل کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں جب حضرت معاذ بن جبل کی وفات ہونے لگی تو انہوں نے مجھ کو حکم کیا کہ تم علم صرف چار بزرگوں سے حاصل کرنا۔ عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن سلام، سلمان الفارسی، اور ابوالدرداء[2]

حضرت عمر کا ذوق قرآنی صحابہ کرام میں جو حضرات تفسیر قرآن کی خدمت انجام دیتے تھے، ان کے حالات واقوال پر نظر ڈالی جائے تو ان میں ایک اور حیثیت سے بھی فرق نظر آئے گا۔ "حضرت عمر کاروبار خلافت کو انجام دیتے تھے، فتوحات ممالک اور سیاسی امور کی نگرانی کا کام کرتے تھے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ نہ تو احادیث آپ سے زیادہ تعداد میں مروی ہیں۔ اور نہ قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق ہی آپ کے اقوال کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن در اصل وہ حریم اسلام کے بہترین محرم راز تھے۔ اور اُن کی فطرت وطبیعت کو اسلام اور قرآن مجید کی تعلیمات واحکام کے ساتھ ایک رازدارانہ نسبت تھی۔ حضرت ابوذر فرماتے تھے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے،

ان اللہ وضع الحق علی لسان عمر یقول بہ	اللہ تعالیٰ نے حق کو عمر کی زبان پر رکھ دیا ہے جس کو وہ کہتے ہیں

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۰۴ [2] الاتقان فی علوم القرآن سیوطی

لیکن ان کی فہم عقل قضائی تھی۔ یعنی جہاں تک اسلامی احکام کا تعلق ہے حضرت عمرؓ کا فیصلہ ایک بڑی حد تک شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منشاء سے قریب ہوتا تھا۔

حضرت ابن عباس کی رمز شناسی

رہی یہ بات کہ اس حکم کی حکمت اور اس میں رمز کیا ہے تو غالباً اس معاملہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عمرؓ پر فوقیت رکھتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق دعا کی تھی۔

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ — اے اللہ تو ابن عباس کو دین میں نظر تفقہ عطا فرما۔

بعض روایتوں میں بجائے "فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ" کے "عَلِّمْہُ التَّاْوِیْلَ" ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "اے اللہ تو قرآن مجید کی آیات کا صحیح مصداق ابن عباس کو بتا دے"

حضرت ابن عباسؓ حضرت عمرؓ کے برخلاف سیاسی کاموں میں حصہ نہیں لیتے تھے، حد سے زیادہ محتاط تھے۔ دن رات تعلیم و تعلم اور تدریس و تدرس میں بسر کرتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث عموماً انصار کے پاس تھیں، میں حدیث کی جستجو میں کسی انصاری کے پاس آتا۔ اور اس کو دروازے پر سوتا ہوا پاتا تو وہیں دروازہ پر بیٹھ جاتا تھا، ہواؤں کے تھپیڑے مجھ کو پریشان کرتے تھے۔ آخر کار بیدار ہونے کے بعد جب میں وہ روایت سن لیتا تو واپس چلا آتا تھا"۔ اس انہماک و مشغولیت کے علاوہ حضرت ابن عباسؓ شعر جاہلیت، انساب اقوام، اور تاریخ عرب سے پورے واقف تھے۔ حضرت عمرؓ بھی ابن عباسؓ کی یہ خصوصیت تسلیم کرتے تھے۔ اور جب کبھی انہیں قرآن مجید کے کسی لفظ میں اشکال پیش آیا انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف ہی رجوع کیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ قرآن مجید کی سورہ عَبَسَ میں جو لفظ اَبًّا آیا ہے اس کے معنی کے متعلق چند صحابہ میں اختلاف ہوا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا "چلو ابن عباسؓ کے پاس چلیں وہ ہم سب سے زیادہ لغتِ عرب کے جاننے والے ہیں"۔

حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے

ارشاد فرمایا۔ "نِعْمَ ترجمان القرآنِ انت عبد اللہ بن مسعود کا قول تھا۔ نعم ترجمان القرآن عبد اللہ بن عباس۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا کہ وہ آسمان اور زمین کونسے ہیں جن کی نسبت فرمایا گیا ہے۔ "کانتا رتقاً ففتقنٰھما" ابن عمر نے اس شخص کو خود کچھ جواب نہیں دیا۔ بلکہ ارشاد ہوا۔ "ابن عباس کے پاس جاؤ اور ان سے اس کے متعلق دریافت کرو، پھر مجھ سے آکر اسے کہہ جانا۔ حضرت ابن عباسؓ کے پاس وہ شخص آیا تو آپ نے جواب دیا۔ آسمانوں کا رتق تو یہ ہے کہ ان سے بارش نہیں ہوتی تھی، اور زمینوں کا رتق یہ تھا کہ ان میں روئیدگی نہیں پائی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فتق کر دیا تو آسمانوں سے بارش ہونے لگی اور زمینوں میں نباتات پیدا ہونے لگیں"

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ ایک دفعہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ کے متعلق صحابہ میں اختلاف ہوا۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا" آپ کیا فرماتے ہیں۔ انہوں نے کہا" میں وہی جانتا ہوں جو ابن عباسؓ جانتے ہیں"

یہ اور اس طرح کے سیکڑوں آثار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل زبان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے سرفراز ہونے میں یکساں وہم رتبہ ہونے کے باوجود تمام صحابہ فہم قرآن میں یکساں نہیں تھے۔ بلکہ ان میں بعض خاص خاص صحابہ ہی ایسے تھے جو درحقیقت ذمہ دارانہ طور پر تفسیر قرآن کی خدمت انجام دے سکتے تھے۔ اور ان کی اس خصوصیت کو اَجِلّۂ صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ ان کی اس برتری اور فضیلت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں تھی کہ وہ ذوق قرآنی جو محض ایک عطیۂ خداوندی ہے ان کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ افراط کے ساتھ مرحمت ہوا تھا۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

پھر یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ آج ایک مدعی علم جو گو اپنے "بغدادی بہرہ" کی طرح

مروجہ عربی تو لشم پشم بول سکتا ہے، لیکن عربی صرف ونحو سے ناآشنائے محض ہے" اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ آج ہر شخص قرن اول کے مفسرین کرام کی طرح قرآن مجید کو سمجھ سکتا ہے۔

وائے گر در پس امروز بود فردائے!

تیسری شرط اتقاء دنیا کے مختلف علوم وفنون اور مختلف زبانوں میں مہارت اور بصیرت پیدا کرنے کے لئے خاص خاص شرائط ہوتی ہیں، اگر وہ طالب میں پائی جائیں گی تو اس کو اس علم خاص میں مہارت پیدا ہو سکے گی ورنہ نہیں۔ شیخ بوعلی سینا نے اپنی مشہور کتاب "اشارات" کے آخر میں بڑے زور سے اپنے شاگرد کو نصیحت کی ہے کہ "میری یہ کتاب ہر شخص کو نہ پڑھائی جائے، بلکہ ان ہی لوگوں تک اس کو محدود رکھا جائے جو اہل جدل وسفسطہ نہیں ہیں اور اگر اس کے خلاف کیا گیا تو میں خدا کے ہاں تمہارا دامن پکڑوں گا" پس اسی طرح قرآن مجید کے مطالب کو واقعی طور پر سمجھنے کے لئے علوم وفنون کی دستگاہ اور زبان عربی کے لطیف ذوق کے علاوہ تیسری اہم چیز "اتقاء" ہے۔

اتقاء سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص روحانی اعتبار سے اس بات کی صلاحیت رکھتا ہو کہ کلام الٰہی کو سن کر اس کا اثر قبول کر سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی دوا کتنی ہی مفرح اور مقوی ہو، لیکن اگر جسم تندرست نہیں ہے اور معدہ وجگر کے فاسد ہونے کی وجہ سے قوت ہاضمہ بے کار اور تولید دم کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے، تو وہ دوا اپنا اثر نہیں کر سکتی۔ بلکہ بسا اوقات مضر نتائج کے پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ اسی پر عالم روحانی ونفسانی اور اس کے امراض وطرق علاج کو قیاس کر لینا چاہیئے۔

قرآن مجید نے اپنے تئیں "ھدی"، "بشریٰ"، "تذکرہ"، اور "نور" کہا ہے مگر ساتھ ہی ان اوصاف کو مطلق نہیں رکھا۔ بلکہ متعدد مواقع پر فرمایا گیا ہے کہ یہ آن ہی لوگوں کے لئے

ہدایت ہے جو ہدایت کے طلبگار رہوں۔ جو مومن و مسلم ہوں، اور جو طہارت و پاکیزگی کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ج هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ o الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ o وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ط وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ (البقرہ)

یہ کتاب ہے اس میں شک کی گنجائش نہیں ان پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے جو غائب چیزوں پر ایمان لے آتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، اور ہم نے انکو جو رزق دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں ان چیزوں پر جو آپ پر اور آپ سے پہلے لوگوں پر نازل کی گئیں۔ اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

دوسرے مقام پر فرمایا گیا۔

وَلَقَدْ جِئْنٰھُمْ بِکِتٰبٍ فَصَّلْنٰہُ عَلٰی عِلْمٍ ھُدًی وَّرَحْمَۃً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (الاعراف)

اور کچھ شک نہیں ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جس کو ہم نے علم کے ساتھ ایماندار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت بناکر مفصل بیان کیا ہے

ایک مقام پر ھُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ اور دوسری جگہ شِفَآءٌ وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ اور ایک جگہ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَرَحْمَۃً وَّذِکْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ اور ایک مقام پر ھُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھُدًی وَّشِفَآءٌ فرمایا گیا ہے

ان صلحاء، اتقیاء اور مومنین قانتین کے برعکس وہ لوگ ہیں جو فسق و فجور میں مبتلا رہ کر اعمال بد کرتے ہیں اور دن رات سرکشی میں مصروف رہتے ہیں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ قرآن سے ان کے دلوں میں نور علم و ہدایت پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اُس سے ان کی گمراہیاں اور بڑھتی ہیں

ہیں۔ ارشاد ہے :-

ولا یزید الظالمین الا خسارا	اور قرآن مجید ظالموں کے لئے نقصان کو ہی بڑھاتا ہے۔
ولیزیدن کثیرا منھم ما انزل	اور اے نبی جو آپ پر اترا ہے وہ ان لوگوں میں سے
الیک من ربک طغیانا وکفرا	بہتوں کی سرکشی اور کفر کو زیادہ کرنے والا ہے۔

ایک آیت میں ایمانداروں اور بے ایمانوں میں فہم قرآن اور اس کے اثرات کے اعتبار سے جو فرق ہے بالکل صراحت کے ساتھ یکجائی طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

قل ھو للذین امنوا ھدی و	اے نبی آپ کہدیجئے کہ قرآن مجید ایمان والوں کے لئے
شفاء ط والذین لا یؤمنون	ہدایت اور شفا ہے اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے
فی اذانھم وقر وھو علیھم عمی	ان کے کانوں میں گرانی ہے۔ اور وہ ان پر اندھا
اولئک ینادون من مکان	ہے۔ یہی لوگ ہیں جو دور کے فاصلے سے پکارے
بعید (حم سجدہ)	جاتے ہیں۔

قرآن سے دو مختلف الطبائع اشخاص پر دو متضاد اثر ہوتے ہیں

اللہ نزل احسن الحدیث کتابا	اللہ نے سب سے اچھی بات اتاری ہے یعنی یکساں
متشابھا مثانی تقشعر منہ جلود الذین	کتاب دہرائی جانے والی۔ اس سے ان لوگوں کے
یخشون ربھم ثم تلین جلودھم	رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے پروردگار سے
وقلوبھم الی ذکر اللہ ذلک	ڈرتے ہیں، پھر اللہ کے ذکر کیلئے ان کی کھالیں نرم ہو جاتی
ھدی اللہ یھدی بہ من یشاء	ہیں اور اُن کے دل بھی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہی جسے چاہتا ہے
ومن یضلل اللہ فما لہ من ھاد	ہدایت دیتا ہے اور جسے اللہ گم کرے اسے کوئی ہدایت دینے
.. .. (الزمر)	والا نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار و اشرار کو قرآن مجید سے اعراض کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو طبعی طور پر رنج ہوتا تھا۔ کیونکہ آپ رحمۃ للعالمین تھے، قرآن سرچشمۂ سعادت و فیض تھا آپ چاہتے تھے دنیا کا کوئی فرد اس سے سیراب ہوئے بغیر نہ رہے۔ لیکن یہ ہو کس طرح سکتا تھا مریض میں دوا کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو طبیب حاذق اور ذو اکیا کرے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو خطاب کر کے فرمایا:۔

ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ	ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت
الا تذکرۃ لمن یخشیٰ ۝ سورہ طٰہٰ	اٹھائیں، مگر ہاں یہ نصیحت ان لوگوں کیلئے ہے جو ڈرتے ہیں

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے جو عموماً خطبوں میں پڑھی جاتی ہے اس میں ارشاد ہے:۔

القرآن حجۃ لک او علیک	قرآن تیرے حق میں دلیل بن کر مفید ہے یا تجھ پر حجت ہے

اس سے مراد یہ ہے کہ اگر قرآن مجید پر عمل کیا جائے، اس کی تعلیم و ارشاد کے مطابق اتقاء و طہارت کی زندگی بسر کی جائے تو وہ یقیناً کارآمد اور مفید ہے، اور اگر ایسا نہیں ہے تو دوسرے لوگ قرآن مجید کی حقیقی مراد کے خلاف اس سے استنباط احکام کریں گے اور گمراہ ہوں گے، وہ الفاظ کے حقیقی مفہوم کو توڑ موڑ کر ان کو ایسے معانی پہنائیں گے جو ہرگز قرآن کی مراد نہیں ہوں گے اس کے برخلاف وہ لوگ ہیں جو دلوں میں خوف خدا رکھتے ہیں۔ روحانیات اور عالم مابعد الموت کے منکر نہیں، زندگی کا مقصد دنیوی شہوات و لذات میں مبتلا رہنا ہی نہیں جانتے، بلکہ اخلاق جمیلہ اور فضائل حمیدہ کی روشنی اپنے اندر پیدا کر کے روحانی کمالات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس طلب صادق، اور اعمال صالحہ کے صدقہ میں اللہ تعالیٰ ان کے دل میں ایسا نور پیدا کر دے گا جس سے عالم غیب کی حقیقتیں خود بخود برافگندۂ نقاب ہو جائیں گی اور مادی کثافتوں کے باعث جن غیر مرئی چیزوں پر ایمان لانا ہمارے لئے دشوار ہوتا ہے، وہ خود بخود ان کے آئینۂ قلب میں

اس طرح جلوہ ریز ہوں گی کہ ان سے انکار نہیں کیا جا سکے گا۔ اور اس وقت صحیح معنی میں ان کا اعتقاد بالجنان ایمان کی صورت اختیار کرلے گا۔

اتقاء کی ایک عقلی توجیہہ فلسفۂ یونان کے طلبہ جانتے ہیں۔ علم کی تعریف میں کتنا زبردست اختلاف ہے۔ کوئی اس کو حصولِ صورت کہتا ہے، کسی کے نزدیک حاضر عند المدرک کا نام علم ہے، اور کوئی قوتِ مدرکہ کو ہی علم بتاتا ہے اور کسی کے خیال میں علم ایک معنیٰ اضافی ہے جو عالم اور معلوم کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ حکماء اشراقیین فرماتے ہیں۔ "علم ایک نور ہے جو اللہ تعالےٰ کسی کے دل میں پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہ معلومات کے ادراک کا منشاء بنتا ہے۔ ہماری رائے میں یہی قول درست ہے اور اسلامی نقطۂ نظر بھی اس کی ہی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ امام شافعی کے دو شعر مشہور ہیں۔

شکوت الی وکیع سوءِ حفظی فاوصانی الی ترک المعاصی

"میں نے اپنے استاد وکیع سے اپنے بدحافظہ ہونے کی شکایت کی، تو انہوں نے گناہوں کے ترک کر دینے

لِانَّ العِلمَ نورٌ مِنَ اِلٰہٖ ونورُ اللّٰہِ لا یعطیٰ لعاصٍ

کی ہدایت فرمائی۔ اور کہا کہ علم خدا کا ایک نور ہے، جو کسی گناہگار کو نہیں دیا جا سکتا

فلسفہ کے نقطۂ نظر سے غور کیجئے تب بھی یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ فلاسفہ نے ادراک کے جو مدارج بتائے ہیں ان میں سب سے اعلیٰ درجہ عقل بالفعل، یا عقل مستفاد ہے۔ اس مرتبہ پر پہنچ کر انسان کو عقل فعال کے ساتھ جو صور معقولہ کا خزانہ ہے، غایت قرب و اتصال حاصل ہوجاتا ہے اور اس اتصال کی بناء پر عقل فعال کی جانب سے جن صور معقولہ کا فیضان ہوتا ہے انسانی ذہن و دماغ ان کو آسانی کے ساتھ قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد پیدا کرلیتا ہے۔ شیخ بو علی بن سینا نے اس نفس کو آئینہ کے ساتھ تشبیہہ دی ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح آئینہ اپنے مقابل

کی صورت کو قبول کر لیتا ہے اور جب تک وہ اس چیز کے مقابل رہے گا اس کی صورت برابر اس میں عکس فگن رہے گی۔ یہاں تک کہ اگر آئینہ منحرف ہو جائے تو اس انحراف کے مطابق اس چیز کی صورت کے انعکاس میں بھی فرق پیدا ہو جائے گا، ٹھیک یہی حال نفسِ انسانی کا ہے، وہ جس قدر مادیت سے بعید اور روحانیت سے قریب ہوگا۔ اسی قدر اس میں عقل فعال کے ساتھ اتصال کی وجہ سے عالم غیب کے حقائق کو قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوگی اور اس کے برخلاف نفس کو مادیت میں جتنا زیادہ انہماک ہوگا اسی قدر اس کو عقلِ فعّال سے بُعد زیادہ ہوتا جائے گا۔ اور غیب کی باتیں اس کے لئے ناقابل فہم ہوتی جائیں گی۔

پس قرآن مجید کی تصریحات کے مطابق نفسِ انسانی میں یہ جِلا اور نورانیت اعمالِ صالحہ اور اتقاء و طہارت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ قرآن مجید کی روحانی تعلیمات کی حقیقی غرض و غایت کو سمجھ سکے، اور اس کے مطالب کو کما ینبغی جان سکے اور اگر یہ نہیں ہے بلکہ اعمالِ فاسدہ کے حجابات اس کے آئینۂ دماغ و قلب پر پڑے ہوئے ہیں تو اس شخص سے صحیح فہم قرآن کی توقع عبث ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن مجید نے اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

لھم قلوبٌ لا یفقھون بھا ولھم	ان کے پاس دل تو ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں،
اعینٌ لا یبصرون بھا ولھم	اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں،
اذان لا یسمعون بھا	اور ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں، یہ
اولئک کالانعام بل ھم اضلّ	لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ
اولئک ھم الغافلون	گمراہ۔ یہ لوگ غافل ہیں۔

چوتھی شرط | فہم قرآن کے لئے چوتھی شرط یہ ہے کہ ایک آیت میں ایک لفظ کو دیکھ کر ہی اس

کی تفسیر و تاویل کی جرأت نہ کی جائے بلکہ تمام قرآن مجید کا مطالعہ بنظر عمیق کر کے قرآن کی زبان اور اس کے طرزِ ادا و طریقۂ بیان کے ساتھ ایک ایسی مناسبت پیدا کر لی جائے کہ تعیین مراد میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اور ایک جگہ جو کسی لفظ کے معنی مراد لئے گئے ہوں وہ کسی دوسرے مقام کے منافی نہ ہوں۔

اس کی تفصیل یوں سمجھیے، ہر متکلم کے مخصوص طرقِ بیان ہوتے ہیں، اور جب تک کوئی شخص متکلم کی اس خصوصیت سے واقف نہیں ہوگا۔ وہ اس کے کلام کی مراد، واقعی طور پر نہیں سمجھ سکے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں طہارت کے باب میں ہے

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا وَاِنْ	اور اگر تم ناپاک ہو تو خوب پاک ہو جاؤ اور اگر تم بیمار
کُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ	ہو یا مسافر ہو یا تم میں سے کوئی قضاء حاجت سے فارغ
اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (الآیۃ)	ہو کر آیا ہو۔ یا تم نے عورتوں سے مقاربت کی ہو۔ الآیہ

"لٰمستم النساء" کی مراد میں علماء مختلف ہیں، ایک طبقہ کہتا ہے کہ "ملامستہ" سے مراد محض بدن کا چھونا ہے، اور مباشرت نہیں، اور اس کی دلیل یوں بیان کرتے ہیں کہ لمس کے معنی حقیقی چھونا ہے اور جب تک معنی حقیقی کا مراد لینا دشوار نہ ہو۔ معنی مجازی کی طرف رجوع کرنا درست نہیں ہے علماء کا دوسرا گروہ ہے جو اس کو صحیح تسلیم نہیں کرتا اور ملامستہ کے معنی یہاں مباشرت مراد لیتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس موقع پر اس بحث میں پڑنا کہ لمس کے معنی حقیقی کیا ہیں اور معنی مجازی کیا؟ اور پھر معنی مجازی اس وقت تک مراد نہیں لیے جا سکتے جب تک کہ معنی حقیقی کے مراد لینے میں تعذر نہ ہو چنداں مفید مطلب نہیں۔ بلکہ ضرورت یہ دیکھنے کی ہے کہ لمس اور اس کے ہم معنی لفظ مس لغت کے اعتبار سے کس معنی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ دونوں لفظ قرآن مجید میں کتنے مقام پر آئے ہیں اور وہاں ان سے کیا مراد لی گئی ہے

اس سلسلہ میں تحقیق و تلاش سے کام لیا جائے، تو واضح ہوتا ہے کہ زن و شوئی کے تعلقات بیان کرنے میں قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے کہ وہ ان مواقع پر تصریح سے کام نہیں لیتا بلکہ کنایۃً ان چیزوں کو بیان کرتا ہے۔ مثلاً ایام حیض میں مجامعت سے منع کرنا منظور تھا تو فرمایا گیا۔

فاعتزلوا النساء فی المحیض (البقرہ) عورتوں سے بحالت حیض الگ رہو۔

طلاق کے احکام میں ہے۔

لاجناح علیکم ان طلقتم	اگر تم عورتوں کو ان کو چھونے سے قبل
النساء مالم تمسوھن (البقرہ)	طلاق دو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے

یہاں لفظ مس ارشاد فرمایا گیا ہے، مگر مراد مباشرت ہے، اسی سلسلہ میں دوسرے مقام پر ہے۔

وان طلقتموھن من قبل ان تمسوھن	اور اگر تم نے ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق
وقد فرضتم لھن	دیدی ہے۔ اور تم ان کا مہر بھی مقرر کر چکے ہو تو جو
فریضۃ فنصف ما فرضتم	تم نے مقرر کیا ہے، اس کا آدھا دیدو، مگر ہاں اس
الا ان یعفون (البقرہ)	وقت نہیں جبکہ یہ عورتیں معاف کر دیں۔

اس جگہ بھی مس فرمایا گیا ہے مگر مراد مجامعت ہے۔

پھر عدت کے بیان میں ہے۔

یا ایھا الذین امنوا اذا نکحتم	اے مومنو تم مومنہ عورتوں سے
المومنٰت ثم طلقتموھن	نکاح کرنے کے بعد اگر ان کو چھونے
من قبل ان تمسوھن فما لکم	سے قبل طلاق دے دو تو ان کے ذمہ

عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا (الاحزاب) تمہارے لئے عدت نہیں ہے۔

یہ آیت اس باب میں تصریح ہے کہ مس سے مراد مباشرت ہی ہے، کیونکہ عدت استبرا رحم کے لئے ہوتی ہے اس کے نہ ہونے کا حکم اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ فقدان مباشرت کے باعث استبرا کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

ایک جگہ اسی تعلق کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وقد افضیٰ بعضکم الیٰ بعض جب کہ تم میں سے ایک نے اپنے تئیں دوسرے کے حوالہ کر دیا ہو۔

ان آیتوں کے مطالعہ اور ان میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے، اس کے طرز ادا کے معلوم کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ "لمستم النساء" میں بھی لمس سے مراد محض چھونا نہیں ہے

ایک شبہ اور اس کا جواب یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ ان آیات مذکورہ میں تو مس کا لفظ متعدد بار آیا ہے اس لئے یہ لمس کے معنی کے لئے کس طرح حجت بن سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ لغت میں مس کے معنی چھونا ہیں اور لمس کے معنی ٹٹولنا ہیں۔ یعنی لمس کے مفہوم میں بہ نسبت مس کے مخالفت میں شدت پائی جاتی ہے۔ پس جب مس سے مراد مباشرت ہو تو لمس سے مراد مباشرت بطریق اولیٰ ہو سکتی ہے۔ اس طرح اگر قرآن مجید کے کسی لفظ کی مراد کو متعین کرنے کے لئے خود قرآن مجید سے مدد لیجائے تو غالباً وہ اختلاف و تشتت نہ پیدا ہو جو عموماً تفسیروں میں نظر آتا ہے۔ اور نہ وہ گمراہی پیدا ہو جو قرآن مجید کے طرز خطاب و طریقۂ بیان سے واقفیت و مناسبت بہم پہنچائے بغیر کسی آیت کی تفسیر سے پیدا ہوتی ہے۔ اور غالباً اسی بنا پر خود صاحب قرآن نے فرمایا ہے۔

القرآن یفسر بعضہ بعضاً قرآن مجید کا بعض خود اس کے بعض کی تفسیر کرتا ہے

ایک دوسری مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں آیت ہے۔

واذکروا اللہ فی ایامٍ معدوداتٍ	اور تم چند گنے چنے دنوں میں اللہ کو یاد کرو،
فمن تعجّل فی یومین فلا اثم علیہ	اور جس شخص نے دو دنوں میں جلدی کی اس پر کوئی
ومن تاخر فلا اثم علیہ لمن اتقیٰ	گناہ نہیں ہے اور جس نے تاخیر کی اس پر بھی
واتقوا اللہ واعلموا انکم الیہ	کوئی گناہ نہیں ہے یہ اُن کیلئے ہے جو خدا سے ڈرتے
تحشرون .. البقر ..	ہیں تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم اس کے ہی
.. ..	پاس جمع ہوگے۔

اس آیت میں جو لفظ ذکر آیا ہے۔ اس سے مُراد تمام ائمہ تفسیر کے نزدیک ایام حج میں بمقام منیٰ رمی جمار کرنا ہے۔ اور "ایام معدودات" سے مراد ایام تشریق ہیں یعنی ماہ ذی الحجہ کی ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ تاریخیں اب ایک کج بحث آدمی کہہ سکتا ہے کہ لغت میں تو ذکر کے معنی فقط یاد کرنا ہیں، آپ کس طرح ذکر سے مراد ایک مخصوص فعل عبادت (رمی جمار) لے سکتے ہیں۔ اسی طرح معدودات جمع قلت کا صیغہ ہے جو تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے، اس میں چند خاص دنوں کا ذکر نہیں، اگر اس پر الف لام تعریف کا داخل ہوتا تو اس کو عہد کا مراد لے کر تخصیص پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن ایام اور معدودات دونوں نکرہ ہیں۔ پھر ان سے کیونکر چند خاص دن مراد ہو سکتے ہیں۔ پس اگر کسی شخص نے سال کے چند غیر معین ایام میں بھی خدا کو کسی طرح یاد کر لیا ہے تو اس نے اس آیت کا حکم پورا کر دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں بیشک لغت میں ذکر کے معنی یاد کرنا ہی ہیں۔ لیکن قرآن مجید کا یہ انداز خاص ہے کہ وہ خاص خاص عبادتوں کا نام لیتا۔ بلکہ اُن کی جو اصل روح ہے اس کا ذکر کر دیتا ہے۔ اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس عبادت کی اصل غرض معلوم ہو جائے، اور وہ اس سے کسی وقت میں بھی غافل نہ ہوں۔ دیکھیے! عرفات سے واپس ہو کر مزدلفہ میں قیام

کرنے کا حکم ہے: اس کو یوں بیان فرمایا گیا۔

فاذا افضتم من عرفاتٍ فاذکروا	پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو اللہ کو مشعر الحرام
اللہ عند المشعر الحرام واذکروہ	کے پاس یاد کرو، اور جس طرح اللہ نے
کما ھداکم وان کنتم من قبلہ	تم کو بتایا ہے۔ اس طرح یاد کرو۔ اگرچہ تم
لمن الضالین (البقرہ)	پہلے سے بے خبر تھے

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ محض زبان سے خدا کو یاد کر لینا۔ یا غیر شرعی اعمال کر کے ذکر اللہ کے فریضہ سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرنا بالکل بے سود اور گمراہی ہے بلکہ ذکر وہی معتبر ہے جو خدا نے اپنے رسولِ برحق کے ذریعہ مخصوص طرقِ عبادت کے ساتھ لوگوں کو بتایا ہے۔ اسی مضمون کی طرف آیت ذیل میں توجہ دلائی گئی ہے۔

فاذا امنتم فاذکروا اللہ کما	جب تم ماموں ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو اس طریقہ کے
علمکم ما لم تکونوا تعلمون (البقرہ)	مطابق جو اللہ نے تم کو بتایا ہے ایک ایسا طریقہ جو تم نہیں جانتے تھے

صبح و شام کی نمازوں کو بھی ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے، ارشاد ہے

واذکر اسم ربک بکرۃً واصیلاً	تم صبح شام اللہ کے نام کو یاد کرو

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید میں متعدد مقام پر ذکر سے مراد کوئی خاص عبادت نہیں بلکہ صرف یاد کرنا ہی ہے۔ جیسے آیات ذیل میں۔

(۱) واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون	اور اللہ کو تم کثرت سے یاد کرو تا کہ فلاح پاؤ
(۲) واذکر اسم ربک وتبتل	تم اللہ کو یاد کرو اور اس کی طرف یکسو
الیہ تبتیلا	ہو جاؤ۔
(۳) رجال لا تلھیھم تجارۃ	وہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کو اللہ کی یاد سے نہ تو

وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ — تجارت غافل کرتی ہے اور نہ خرید و فروخت

لیکن قرآن مجید میں جہاں جہاں لفظ ذکر آیا ہے ان سب مقامات کو پیش نظر رکھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن مقامات پر ذکر مطلق نہیں بلکہ کسی خاص زمانہ یا مکان کی قید کے ساتھ آیا ہے، وہاں مطلقاً یاد کرنا نہیں بلکہ کوئی خاص طریقہ عبادت مراد ہوتا ہے۔ پھر وہ طریقہ عبادت کیا ہوتا ہے؟ اس کی تفصیل یا تبیین یا تو خود قرآن مجید کر دیتا ہے۔ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قول یا عمل سے اس کا بیان کر دیتے ہیں۔ صورت ثانی میں یہ ماننا لازمی ہوگا کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مراد متعین کر دی ہے جس سے انحراف کرنا کسی طرح جائز نہیں ہوگا اور اس فعل نبوی کو عمل میں لائے بغیر اگر قرآن مجید کے لفظوں کو لغوی معانی کے اعتبار سے کوئی عملی شکل دی گئی تو وہ یقیناً نامعتبر ہوگی۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آیت زیر بحث یعنی "وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ" میں ذکر کو چونکہ "ایامِ معدودات" کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ اس لئے یہاں ذکر سے مراد صرف زبان و قلب سے یاد کر لینا نہیں بلکہ کوئی مخصوص طریق عبادت ہے، وہ کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے اقوال مبارکہ اور عملِ مقدس سے واضح کر دیا ہے کہ وہ "رمی جمار" ہے۔

اب رہی "ایام معدودات" کی بحث تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ اگرچہ نکرہ ہیں، لیکن آیت کا سیاق و سباق دلالت کرتا ہے کہ ان سے مراد چند خاص دن ہیں، وہ دن کونسے ہیں؟ ان کا بیان بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا ہے، اس بنا پر اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ "تم ایامِ تشریق میں رمی جمار کرو"، پس وہ شخص جو اس آیت کو اس کے ظاہری معنی پر محمول کر کے یہ سمجھتا ہے کہ خدا کو کسی طرح بھی چند دنوں میں یاد کر لینا اس آیت کے حکم کو پورا کر دیتا ہے۔ اور اس کے لئے رمی جمار و ایام تشریق کی کوئی قید نہیں وہ یقیناً فہم قرآن سے بہت بعید ہے، اور

راہ حق سے بے شبہ منحرف ہے۔

احکام قرآنی میں بصیرت پھر جس طرح قرآن مجید کے مفرد الفاظ کے معنی کی تعیین کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ لفظ قرآن میں جہاں جہاں آیا ہے ان سب مواقع کو پیش نظر رکھا جائے۔ اسی طرح کسی آیت سے کوئی حکم استنباط کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حکم قرآن مجید میں جتنے مواقع میں بیان کیا گیا ہے۔ ان سب کو ملحوظ رکھا جائے اور ہر ایک موقع کے سیاق و سباق پر بصیرت نگاہ ڈال کر اس حکم کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ قرآن مجید کی مثال جدید زمانہ کی کسی مرتب و مہذب قانونی کتاب کی نہیں ہے جس میں تمام احکام مختلف ابواب اور پھر ہر باب کے ذیل میں مختلف دفعات کے ماتحت ترتیب اور ایک خاص نظم و نسق کے ساتھ بیان کر دیئے جاتے ہیں بلکہ اس کی مثال اس طبیب حاذق کی سی ہے جو مریض کے لمحہ بہ لمحہ متغیر ہونے والے احوال کو دیکھ کر نسخہ میں ترمیم و تنسیخ کرتا رہتا ہے اور یا وہ فوج کے اس قائد کی طرح ہے جو طریق جنگ کی مصلحتوں اور فریق مخالف کی مورچہ بندیوں، اور اصول اقدام و تاخر کے پیش نظر کبھی فوج کو کسی محاذ پر لڑنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اور کبھی کسی دوسرے محاذ پر جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ کبھی وہ تلوار استعمال کراتا ہے اور کبھی بندوق یا توپ، کبھی وہ آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے اور کبھی فوج کو مصلحتاً پیچھے ہٹاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب احکام اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری اور واجب العمل ہیں، سطحی طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک حکم دوسرے حکم کے منافی ہے، یا ایک نسخہ دوسرے نسخہ کی ضد ہے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باہمی تضاد اور منافات کے باوجود ان میں کا ہر ایک حکم اور نسخہ اپنے مخصوص موقع و محل کے اعتبار سے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دوسرا اپنے موقع و محل پر۔ اگر ایک کو دوسرے کی جگہ پر رکھ دیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز تباہی اور بربادی کے اور

کیا ہو سکتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جو دین دنیا میں آخری بن کر آیا ہو اس میں ایسی لچک اور تنوع احکام ہونا ضروری ہے۔

انسان کی تمام انفرادی و اجتماعی ضرورتوں پر شامل ہونے کی یہی وہ صفت قرآن ہے جس کو حکمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے:۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ	یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں

ایک جگہ ارشاد ہے:

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ	یہ اس حکمت میں سے ہے جو آپ کے
مِنَ الْحِكْمَةِ (بنی اسرائیل)	پروردگار نے آپ پر نازل کی ہے۔
ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ	یہ وہ آیتیں اور حکمت والا ذکر ہے جو ہم
وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (آلِ عمران)	تم پر پڑھتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی صفتِ جامعیت کو ایک دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا گیا۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ	اور ہم نے آپ پر قرآن مجید نازل کیا جو ہر
شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى	چیز کو کھول کر بیان کرتا ہے اور جو مسلمانوں
لِلْمُسْلِمِيْنَ (النحل)	کیلئے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں کجی ہوتی ہے وہ اس تنوعِ احکام کو برداشت نہیں کر سکتے ان کی قوتِ فکر مختلف احکام کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنے سے قاصر ہوتی ہے تو وہ کسی ایک طرف جھک جاتے ہیں، اور اپنی طرف سے کسی ایک قطعی حکم کا یقین کر لیتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ	کیا تم قرآن مجید کے بعض حصوں پر ایمان لاتے

ببعض، فما جزاء من یفعل ذٰلك	ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو، تو کیا نہیں ہے
منکم الا خزی فی الحیوٰۃ الدنیا	اس شخص کی جزا جو تم میں سے ایسا کرتا ہو مگر
ویوم القیٰمۃ یردون الی اشد	دنیا کی زندگی میں ذلیل ہونا اور قیامت کے
العذاب وما اللہ بغافل عما	دن وہ لوگ شدید ترین عذاب میں مبتلا کئے
تعملون (البقرہ)	جائیں گے۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے

نکتہ | یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں رسوا ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے ابھی ذکر کی۔ یعنی یہ کہ لوگ جب قرآن مجید کے مختلف احکام میں باہمی توازن و تناسب کو قائم نہیں رکھ سکیں گے اور کسی ایک جہت کی طرف مائل و راغب ہو کر ایک ہی حکم کو معمول بہ بنا لینگے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہوگا کہ انسانی اور اجتماعی ضرورتوں کے دوسرے گوشے تشنۂ تکمیل رہ جائیں۔ اور وہ اس بنا پر دنیوی تباہ حالی کے قعر عظیم میں جا پڑیں، جو مریض طبیب حاذق کی تجویز کے مطابق نو بنو نسخوں کو استعمال نہیں کرتا اور صرف ایک ہی نسخہ کے استعمال پر جمود کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی امید شفا معلوم!

ناسخ و منسوخ | احکام کے ظاہری تعارض کو دیکھکر بہت سے مفسرین آیات قرآنی میں ناسخ و منسوخ کے قائل ہو گئے ہیں اور اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ بعض علماء نے اس موضوع پر بھی مستقل کتابیں تصنیف کر ڈالی ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں، خاص اس موضوع پر اتنے لوگوں نے تصنیفات کی ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا[1]۔ پھر ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت علیؓ نے کسی قاضی سے پوچھا، "تم ناسخ و منسوخ کو جانتے ہو"؟ اس نے کہا، "نہیں"، آپ نے فرمایا، "تم خود بھی ہلاک ہو گئے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے"، ہماری رائے میں اگر یہ مقولہ درست ہے تو اس سے مراد

---

[1] الاتقان - جلد ۲ ص ۲

نسخ کے اصطلاحی معنی نہیں ہیں بلکہ موارد احکام مراد ہیں۔

نسخ سے مفسرین کی مراد لیکن اگر ناسخ و منسوخ کی معنوی تنقیح کی جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مفسرین نے اگر کسی آیت پر ناسخ و منسوخ کا اطلاق کیا ہے تو محض مجازاً کیا ہے۔ ورنہ دراصل کوئی آیت عام اصطلاحی معنی کے اعتبار سے منسوخ نہیں ہے۔ نسخ کے معنی حقیقی ہیں زائل کر دینا اس بنا پر ایک آیت دوسری آیت کے لئے صحیح معنی میں ناسخ اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ منسوخ آیت پر عمل کرنا مطلقاً ناجائز قرار دیدیا جائے، حالانکہ قرآن کی کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس پر مطلقاً عمل کرنا ناجائز ہو۔ مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں کفار کے ہاتھوں سے جو اذیت پہنچے اُس پر صبر کرنا چاہیئے۔ مگر دوسرے مواقع میں نہایت پرزور طریقہ پر جہاد کی ترغیب دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

یاایھا النبی جاھدِ الکفّار	اے نبی آپ کفار و منافقین کے ساتھ جہاد
والمنافقین واغلظ علیھم (توبہ)	کیجیے اور ان پر سخت ہو جائیے۔
یاایّھا الذین اٰمنوا قاتلوا الذین	اے مومنو! تم اُن کفار سے جنگ کرو جو
یلونکم مِنَ الکفّارِ ولیجدوا	تم سے قریب ہیں اور چاہیئے کہ وہ تم میں
فیکم غلظۃ (توبہ)	سختی محسوس کریں۔

مفسرین نے آیت صبر علی الایذاء اور آیات جہاد میں تعارض دیکھکر آیات جہاد کو آیت صبر کے لئے ناسخ کہا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ حقیقتاً نسخ ہے؟ صبر کرنے کا حکم اس زمانہ میں تھا جبکہ مسلمان کمزور تھے اور وہ کفار کو جواب ترکی بہ ترکی نہیں دے سکتے تھے، مگر جب خدا نے اُن کو طاقت و قوت عطا فرما دی، اور وہ جنگ کے قابل ہو گئے تو انہیں جہاد کا حکم دیدیا گیا۔ اس بنا پر ان دونوں آیتوں کے ملا دینے سے دو حکم ثابت ہوتے ہیں:۔

(۱) اگر مسلمان کمزور ہوں تو انہیں کفار کے مصائب پر صبر کرنا چاہیئے اور اندرونی طور پر کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ قوی ہو جائیں۔

(۲) پھر جب مسلمان قوی ہو جائیں تو انہیں جہاد کرنا چاہیے۔ اب خاموش بیٹھا رہنا، اور کافروں کے مصائب برداشت کرتے رہنا ان کے لئے ناجائز ہے

غور کیجیے جب دونوں آیتوں سے مختلف حالات کے مناسب دو مختلف احکام مستنبط ہوتے ہیں تو اب ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کے لئے ناسخ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ کسی ایک حکم کو دوسرے حکم کے اعتبار سے منسوخ زمانی یعنی ہنگامی طور پر منسوخ کہہ سکتے ہیں جس طرح طبیب ایک نسخہ کو ملتوی کر کے دوسرا نسخہ لکھتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اب پہلے نسخہ کا استعمال سراسر ممنوع قرار دے دیا گیا ہے، اور وہ کسی حالت میں بھی قابل استعمال نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اب مریض کی موجودہ حالت کے پیش نظر اس کو یہ نسخہ استعمال نہیں کرنا چاہیئے، لیکن اگر اس کی حالت اولیٰ عود کر آئے تو ظاہر ہے کہ اس کو پھر وہ پہلا ہی نسخہ استعمال کرایا جائے گا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ "سورۃ الکافرون" کی آیت "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے) منسوخ التلاوۃ نہیں، منسوخ الحکم ہے، لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو اس کو منسوخ کہنا ہی درست نہیں ہے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کافروں کے اپنے دین پر قائم رہنے پر رضامندی کا اظہار کیا جا رہا ہے جو اس کو منسوخ الحکم قرار دیا جائے بلکہ صورت یہ ہے کہ توحید کا داعی برحق کافروں کو اسلام کی دعوت دیتا ہے اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار دیتا ہے یہ لوگ اس دعوت کو سن کر صرف اسے قبول کرنے سے انکار ہی نہیں کرتے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں، اور گستاخانہ برتاؤ برتتے ہیں اور الٹا خود آپ کو

اپنا مذہب اختیار کر لینے کی دعوت دیتے ہیں اس پر آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ اگر تم دعوتِ اسلام قبول نہیں کرتے ہو مت کرو۔ میں بہرحال تمھارے بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا۔ تم جانو تمہارا کام۔ تم کو تمہارا مذہب مبارک ہو اور مجھ کو میرا دین "۔ اب اس تقریر کو ذہن میں رکھ کر پوری سورت پڑھ جائیے اور بتائیے کہ کیا کسی ایک لفظ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار کو اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت دیدی گئی ہے۔ اس سورت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا حاصل اس مضمون سے زیادہ نہیں جو وَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ یا لنا اعمالنا ولکم اعمالکم میں بیان فرمایا گیا ہے، پس اس سورت کی کسی آیت پر عام اصطلاحی معنی کے اعتبار سے نسخ کا اطلاق صحیح ہو ہی نہیں سکتا۔

علامہ محمود آلوسی نے اسی سورت کی آخیر آیت میں کئی احتمالات بیان کئے ہیں۔ پہلے احتمال کی بنا پر تو انہوں نے صاف کہا ہے۔

والایۃ علی ماذکر محکمۃ غیر منسوخۃ — اس احتمال پر آیت محکم غیر منسوخ ہے

دوسرا احتمال انہوں نے وہی بیان کیا ہے جو ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اور اس کے متعلق بھی آگے چل کر فرماتے ہیں وعلیہ لا نسخ ایضا اور اس احتمال پر بھی نسخ نہیں ہے۔

اس گفتگو سے مقصد یہ ہے کہ اگر اسی طرح تمام اُن آیات میں غور کیا جائے جن کے متعلق نسخ کا ادعا کیا گیا ہے تو یہ حقیقت صاف روشن ہو جائے گی کہ قرآن مجید کی کوئی ایک آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ یا تو لوگوں نے آیت کے کسی لفظ سے کوئی خاص معنی مراد لے کر کوئی حکم خاص استنباط کر لیا ہے اور اس حکم کو چونکہ منسوخ قرار دیدیا گیا ہے اس لئے انہوں نے خیال کیا کہ آیت ہی سرے سے منسوخ ہو گئی ہے مثلاً قرآن مجید میں ہے:-

فما استمتعتم بہ منھن فاٰتوھن	تم نے جن عورتوں سے تمتع کیا ہے تم
اجورھن فریضۃ (النسا)	اُن کو ان کے مقررہ مہر دے دو۔

اس آیت کے لفظ "استمتعتم" سے بعض لوگوں نے نکاح متعہ مراد لیا اور اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ یہ آیت بھی منسوخ بحکم ہے۔ حالانکہ "استمتعتم" سے مراد لطف اندوز ہونا ہے، متعہ سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی حکم عام بیان کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری آیت آتی ہے جس میں حکم کی کسی خاص موقع و محل کے اعتبار سے تخصیص کر دی جاتی ہے، بعض حضرات اس تخصیص پر بھی نسخ کا اطلاق کر دیتے ہیں، مثلاً عدت کے متعلق ایک آیت ہے

والذین یتوفون منکم ویذرون	اور وہ لوگ جو تم میں سے مرجائیں اور بیویاں
ازواجًا وصیۃ لازواجھم متاعًا	چھوڑیں ان پر اپنی بیویوں کیلئے وصیت کرنا ہے کہ
الی الحول غیر اخراج (البقر)	سال بھر تک اُن کو فائدہ دیں۔ گھر سے نہ نکالیں۔

اس سے بظاہر ثابت ہوتا ہے کہ عدّتِ وفات ایک برس ہے۔ ایک دوسری آیت ہے

والذین یتوفون منکم ویذرون	اور تم میں سے جو مرجائیں اور بیویاں چھوڑیں
ازواجًا یتربصن بانفسھن اربعۃ	تو بیویاں اپنے آپکو چار مہینے دس دن تک (بطور
اشھر وعشرًا فاذا بلغن اجلھن	عدت) روکے رکھیں، پھر وہ جب اس
فلا جناح علیکم فیما فعلن فی	مدت کو پورا کر لیں تو وہ جو کار خیر ہو کریں تم
انفسھن بالمعروف (البقر)	پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عدت وفات ایک سال نہیں بلکہ چار ماہ دس دن ہے اب ان دونوں میں تعارض دیکھکر بعض ارباب تفسیر نسخ کے قائل ہو گئے ہیں۔ حالانکہ

اگر ذرا تعمق سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نسخ یہاں بھی نہیں ہے۔ پہلی آیت میں شوہروں کو حکم کیا جا رہا ہے کہ وفات کے وقت اپنے وُرثاء کو اس بات کی وصیت کر جائیں کہ اگر اُن کی بیوی سال بھر تک گھر میں رہنا چاہیں تو انہیں رہنے دیا جائے، اس مدت میں وہ اپنے اعزا و اقربا سے مشورہ کر کے اپنے لئے کوئی اچھا انتظام کر لیں گی۔ اخلاقی اعتبار سے یہ بات کس قدر بُری ہے کہ ایک عورت جو اپنے شوہر کی رفیقۂ حیات بن کر عرصہ دراز تک ایک گھر میں ساتھ رہی ہے شوہر کی وفات کے بعد اس کے ساتھ ایسی بیگانگی کا معاملہ کیا جائے کہ غریب کو اس گھر میں ایک سال تک بھی قیام کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اب رہا یہ امر کہ عورت کب تک عدت میں بیٹھے اور وہ کب تک کسی دوسرے شخص کے ساتھ نکاح نہیں کر سکتی تو اس کے متعلق دوسری آیت میں صاف طور پر بتا دیا گیا کہ عورت کی مدت عِدّت چار ماہ دس دن ہے (اگر وہ حاملہ نہیں ہے) اب غور فرمائیے۔ ان دونوں میں کیا تعارض ہے جس کی وجہ سے نسخ کا قائل ہونے کی ضرورت ہو۔ چنانچہ حضرت مجاہد بن جبیر جو مشہور مفسر ہیں ان دونوں آیتوں میں نسخ کے قائل نہیں[1] تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ "الفوز الکبیر فی علوم التفسیر" میں ان ہی آیات پر کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

اللہ تعالیٰ کا قول والذین یتوفون الایہ جمہور مفسرین کے نزدیک اربعۃ اشہر وعشرا والی آیت سے اور وصیت میراث وسکنیٰ کے حکم سے منسوخ ہے، لیکن ان دونوں میں تطبیق اس طرح دی جا سکتی ہے کہ متوفی کے لئے تو وصیت کرنا مستحب یا جائز ہے، البتہ عورت پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ وصیت کے مطابق رہے۔ حضرت ابن عباس بھی اسی کے قائل تھے، اور یہی توجیہ آیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ (ص ۱۹)

---

[1] بخاری کی کتاب التفسیر

قرآن میں نسخ کی حقیقت | خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کسی آیت کو کسی آیت کے لئے ناسخ کہنے سے مراد یہ ہے، کہ منسوخ آیت کا حکم بالکل زائل ہو چکا۔ اور اب اس پر عمل کرنا قطعی طور پر ممنوع قرار دیدیا گیا ہے تو جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اس معنی کے اعتبار سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اور اگر بر سبیل مجاز تخصیص عام، یا تعیین مدت، یا تفصیل اجمال پر نسخ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے تو ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں عذر نہیں کہ اس معنی کے لحاظ سے نسخ کا اطلاق ہو سکتا ہے اور غالب یہ ہے کہ علمائے اسلام جو نسخ بولتے ہیں اس سے وہ دوسرے معنی ہی مراد لیتے ہیں

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں

مراد عامة السلف بالناسخ والمنسوخ رفع الحكم بجملته تارة وهو اصطلاح المتاخرين ورفع دلالة العام والمطلق والظاهر وغيرها تارة اما بتخصيص او تقييد او حمل مطلق على مقيد وتفسيره وتبيينه حتى انهم يسمون الاستثناء والشرط والصفة نسخاً لتضمن ذلك رفع دلالة الظاهر وبيان المراد بغير ذلك اللفظ بل بامر خارج عنه ومن تامل كلامهم رأى من ذلك فيه ما لا يحصى وزال عنه به اشكالات اوجبها حمل كلامهم

ناسخ ومنسوخ سے عام سلف کی مراد کبھی حکم کا تمامہ مرفوع ہو جانا ہوتا ہے، یہ متاخرین کی اصطلاح ہے اور کبھی نسخ سے مراد ہوتی ہے، عام مطلق، ظاہر وغیرہ کا رفع کر دینا۔ خواہ وہ تخصیص کے ذریعہ ہو یا تقیید کے یا مطلق کو مقید پر محمول کرنے اور اس کی تفسیر وبیان کے ذریعہ یہانتک کہ یہ حضرات استثنا، شرط اور صفت کو بھی نسخ کہہ دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ دلالت ظاہر کے رفع اور بیان مراد کو متضمن ہوتا ہے، پس نسخ ان کے نزدیک اور ان کی زبان میں اس لفظ کے غیر سے مراد کا بیان کر دینا ہے، اور غیر لفظ ہی نہیں بلکہ کبھی مراد کا بیان کسی امر خارج سے بھی ہو جاتا ہے، جو شخص ان اسلاف کے کلام میں تامل کریگا اُس کو اس میں غیر محدود فوائد نظر آئیں گے

فالنسخ عندهم وفي لسانهم هو بيان المراد

علیٰ الاصطلاح الحادث المتاخر[1]	اور اس سے وہ اشکالات زائل ہو جائیں گے جو نسخ
. . . . .	کو اصطلاح حادث و متاخر پر محمول کرکے پیش آتے ہیں۔

علامہ ابن حزم ظاہری نے ایک اور نکتہ پیدا کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نسخ کی حقیقت بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی چیز کسی مدت کے لئے حرام کرتا ہے (اگرچہ وہ مدت ہم کو نہیں بتائی جاتی لیکن وہ اللہ کے علم میں ہوتی ہے) پھر وہ اس کو مباح کر دیتا ہے، یا اس کے برعکس کوئی چیز کچھ مدت کے لئے مباح ہوتی ہے۔ پھر اس کی مدت گذرنے پر اس کو حرام کر دیا جاتا ہے یعنی یہ نہ کہنا چاہیئے کہ ایک حکم نے دوسرے کو منسوخ کر دیا۔ بلکہ یہ تعبیر زیادہ صحیح ہوگی کہ ایک حکم کے بعد دوسرا حکم نازل ہوا، کیونکہ نسخ بمعنی حقیقی تو یہ ہے کہ پہلا حکم باقی ہو اور پھر دوسرا حکم اس کو مرفوع کر دے اور ظاہر ہے کہ اس قول کے بموجب یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ علامہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

وَمَا هٰهُنَا شَيْءٌ اَصْلًا اِلَّا اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی	اور یہاں بجز اس کے کوئی شے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
اَرَادَ اَنْ يُحَرِّمَ عَلَيْنَا بَعْضَ مَا خَلَقَ	اپنی بعض مخلوق چیزوں کو ہم پر کچھ مدت کے لئے حرام کرنے کا
مُدَّةً مَا ثُمَّ اَرَادَ تَعَالٰی اَنْ يُبِيْحَهَا	ارادہ کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کو مباح کر دے، اور
وَاَرَادَ اَنْ يُبِيْحَ لَنَا بَعْدُ مَا خَلَقَ مُدَّةً	اللہ نے اپنی بعض مخلوق کو کچھ مدت کیلئے ہمارے واسطے
مَا ثُمَّ اَرَادَ تَعَالٰی اَنْ يُحَرِّمَهٗ عَلَيْنَا[2]	مباح کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس کو ہم پر حرام کر دے

علامہ ابوبکر جصاص فرماتے ہیں۔ نسخ کے معنی لغت میں خواہ کچھ ہی ہوں بہرحال شرع میں اس کے معنی حکم یا تلاوت کی مدت کے بیان کر دینے کے ہیں۔ پھر آگے چل کر بعض متاخرین کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تم جانتے ہو قرآن مجید میں عام بھی ہے اور خاص بھی، محکم بھی ہے، اور متشابہ بھی۔ پس وہ

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ (ص ۲۹) [2] الاحکام فی اصول الاحکام ج ۴ ص ۵۹،

شخص جو قرآن میں نسخ کے وجود کا قائل نہیں ہے گویا وہ قرآن میں عام و خاص اور محکم و متشابہ کو ہی نہیں مانتا۔ کیونکہ اس کے قول کے مطابق تو یہ لازم آتا ہے کہ تمام آیات کا ورود ایک ہی شان کا ہو۔[1]

اس تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات پر جب نسخ کا اطلاق کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ازالہ نہیں ہوتا بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ فلاں آیت میں جو حکم بیان کیا گیا تھا۔ وہ فلاں وقت اور اس زمانہ کے مخصوص حالات کے اعتبار سے تھا۔ اب جبکہ حالات دوسرے ہیں۔ ان کے لئے حکم یہ ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ فلاں قسم کے احوال کے لئے فلاں حکم ہے۔ اور فلاں قسم کے احوال کے لئے فلاں حکم، اس سے کسی ایک حکم کا مطلقاً ممنوع ہو جانا لازم نہیں آتا بلکہ یہ تفصیل و تشریح عین کمال دین کی دلیل ہے۔

اصل یہ ہے کہ تمام بحثیں ہوتی رہیں۔ مگر کبھی نسخ کے معنی اور اس کی مراد کی تنقیح کما حقہٗ نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جن بزرگوں نے نسخ کو مانا ہے وہ خود آیات منسوخہ کی تعداد میں بیحد مختلف ہیں۔ پہلے عوام میں مشہور تھا کہ قرآن مجید میں پانسو یا تین سو آیات منسوخ ہیں، کسی نے کہا کہ صرف پچیس آیات منسوخ ہیں، حضرت ابن عباس سے بعض لوگوں نے روایت کی کہ بیس آیات منسوخ ہیں، جن کو علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بھی نظم کر دیا ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ الدہلویؒ نے "فوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں نسخ پر مستقل ایک فصل میں بحث کی ہے۔ اس میں آپ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب "الاتقان" کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ شیخ ابن عربی کے قول کے مطابق تقریباً بیس آیات منسوخ ہیں، اس کے بعد فرماتے ہیں "فقیر را در اکثر بست نظر است" چنانچہ آپ نے ابن عربی کی پوری تقریر نقل کی ہے، اور اس پر جا بجا تعقبات کئے ہیں۔ ہم یہاں اس

---

[1] احکام القرآن ج ۱ ص ۹۷

طویل تقریریں سے صرف ایک آیت کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن عربی فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کا قول،
وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ منسوخ ہے اور اس کے لئے ناسخ دوسری آیت "فمن شہد منکم
الشہر فلیصمہ" ہے۔ حضرت شاہ صاحب اس پر تعقب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اس کو نسخ کہنا صحیح
نہیں۔ میرے نزدیک اصل صورت یہ ہے کہ "یُطِیقُوْنَہٗ" میں جو ضمیر منصوب ہے وہ صوم کی طرف نہیں
بلکہ طعام کی طرف راجع ہے۔ اور فدیہ سے مراد فدیۂ صوم نہیں بلکہ صدقۃ الفطر ہے۔ اس بناء پر اس آیت
کے معنی یہ ہو گئے کہ جو لوگ طعام مسکین دینے کی طاقت رکھتے ہیں، انہیں صدقۃ الفطر ادا کرنا ضروری
ہے، طعام یہاں اگرچہ لفظوں میں متقدم نہیں ہے، لیکن رتبۃً مقدم ہے۔ اس لئے اضمار قبل الذکر بھی لازم
نہیں آتا۔ حضرت شاہ صاحب ابن عربی کی تقریر پر اسی طرح تعقبات کرتے چلے گئے ہیں۔ اور بالآخر
فرماتے ہیں۔

قلت وعلی ما حررنا لایتعین	میں کہتا ہوں ہماری تحریر کے مطابق نسخ صرف
النسخ الا فی خمس آیات	پانچ آیات میں ہے۔ (ص ۱۸ — ۲۱)

آپ کے بعد مفتی محمد عبدہٗ المصری کا زمانہ آیا تو انہوں نے کہا کہ قرآن مجید میں ایک آیت
بھی منسوخ نہیں ہے۔

ہم سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نسخ کے اصل مفہوم کی جتنی تنقیح ہوتی رہی، آیات منسوخہ میں بھی
اسی کے مطابق کمی واقع ہوتی رہی، یہانتک کہ یہ حقیقت خود بخود واضح ہو گئی کہ در اصل قرآن مجید میں
ایک آیت بھی منسوخ نہیں۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہماری تقریر سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ
ہم نسخ کے بالکل قائل ہی نہیں ہیں، اصل یہ ہے کہ جس مذہب میں اشخاص اور قوموں کی تدریجی
اور حالات و نفسیات کے مطابق اصلاح کا کامیاب اصول پیش نظر رکھا گیا ہو اس میں نسخ کا ہونا ناگزیر
ہے، نسخ کی دو قسمیں ہیں نسخ آیات اور نسخ احکام، ہم اس میں سے دوسری قسم کے نسخ کے قائل

ہیں، نسخ آیات کے نہیں۔ پھر نسخ احکام کی دو صورتیں ہیں اوّل یہ کہ ایک حکم دوسرے حکم کو بالکل رفع کر دے۔ جیسے کہ متعہ کی اباحت کا حکم جو قطعی طور پر زائل کر دیا گیا ہے، یا حضرت رسالتمآب کا یہ ارشاد،

کنت نھیتکم عن زیارۃ القبور	میں پہلے تم کو قبروں کی زیارت سے منع
الا فزوروھا	کرتا تھا۔ اب تم ان کی زیارتیں کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آپ کے پہلے "حکم تحریم زیارت قبور" کے لئے ناسخ ہے دوسری صورت یہ ہے کہ نسخ بمعنی تفصیل اجمال تبیین مبہم اور تقیید مطلق ہو، نسخ احکام ان دونوں معنوں کے اعتبار سے سنت میں تو پایا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید میں صرف دوسرے معنی کے ہی اعتبار سے یہ نسخ پایا جاتا ہے، جیسا کہ ہم ابھی بیان کر آئے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

آپ فرمائیں گے اگر ایسا ہی ہے تو قرآن مجید کی آیت

ما ننسخ من آیۃ او ننسھا	ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے یا بھلا دیتے
نات بخیر منھا او مثلھا	ہیں تو اس سے بہتر ایک آیت لاتے ہیں۔

کا کیا مطلب ہے؟ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات میں نسخ موجود ہے، اس شبہ کے جواب کئی ہو سکتے ہیں۔ یہاں صرف دو کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔ پہلا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں آیۃ کا لفظ مطلق ہے۔ اس سے صرف قرآن مجید کا حکم یا قرآن مجید کی کوئی آیت ہی مراد لینا صحیح نہیں ہے اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یہاں آیت سے مراد وہ احکام ہیں جو اسلام سے قبل دوسرے ادیان و شرائع کے موجود تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انکو منسوخ کر کے دوسرے احکام بیان کئے جائیں، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلکہ یہ احکام بہ نسبت احکام سابقہ کے بہتر ہوں گے۔ صاحب تفسیر المنار نے مفتی محمد عبدہٗ المصری کی ایک طویل تقریر آیت نسخ کی تفسیر کے ذیل میں نقل کی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں اس سے ہماری تائید ہوتی ہے:۔

علماء[1] انفسائہ کے فہم میں متحیر ہیں جیساکہ انہوں نے بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض نے کہا ہے کہ ننسھا کے معنی بغیر نسخ کے آیت کو اسکی اپنی حالت پر چھوڑ دینا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ یہ معنی اگر لغۃً صحیح بھی ہوں تب بھی ان کی تفسیر کے شایاں نہیں، کیونکہ کسی آیت کو بغیر نسخ کے اس کو اپنی حالت پر چھوڑتے ہوئے اس سے بہتر کوئی آیت لانے کے معنی ہی کچھ نہیں ـــــ صحیح معنی جو آیت کے سیاق کے ساتھ آخر تک متناسب رہتے ہیں یہ ہیں کہ یہاں آیت سے مراد وہ نشانیاں ہیں۔ جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انبیاء کی تائید کرتا ہے، تو اب مرادیہ ہوئی کہ ہم اگر کسی نبی کی نبوت پر دلالت کرنیوالی کسی دلیل کو ترک کردیتے ہیں تو اس سے بہتر کوئی دوسری دلیل اس کی جگہ قائم کردیتے ہیں، یا اگر مدت دراز گذر جانے کے باعث ہم اس کو لوگوں کی یاد سے زائل کردیتے ہیں تو اپنی قدرت کاملہ سے ایک ایسی دلیل اور پیدا کردیتے ہیں جو پہلی دلیل سے بھی زیادہ قوی اور نبوت کو ثابت کرنیوالی ہو" یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس صرف ایک ہی دلیل نہیں ہے جو وہ تمام انبیاء کو عطا فرمائے[1]۔"

دوسرا جواب یہ ہے کہ اچھا مان لیا کہ آیت سے مراد آیتِ قرآن ہی ہے۔ لیکن "ننسخ" کے معنی حکم کو بالکل زائل کردینے کے نہیں ہیں بلکہ تبدیل حکم کے معنی ہیں جیساکہ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔

واذا بدلنا اٰیۃً مکان اٰیۃٍ واللہ	اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت
اعلم بما ینزل قالوا انما انت	رکھتے ہیں اور اللہ جس چیز کو نازل کرتا ہے
مفتر ۔ ..(النحل)	اس کو بہتر جاننے والا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں
۔ ۔ ۔ ۔ ۔	آپ تو افترا باندھنے والے ہیں۔

---

[1] تفسیر المنار ج ۱ ص ۴۱۶۔

اس تبدیل آیت بالآیت کا مفہوم کیا ہے ؟ یہ کہ ایک زمانہ میں کسی حکم خاص کے لئے کوئی آیت نازل ہوئی، پھر جب حالات بدل گئے تو دوسری آیت نازل ہوئی اور اس میں حکم جدید کا امر فرمایا گیا۔ اس کا مآل یہ ہوا کہ دو مختلف حالات کے اعتبار سے دو مختلف احکام نازل ہوئے، اور دونوں اپنی اپنی جگہ برحق اور درست ہیں۔ مسلمان کمزور تھے۔ کافروں اور مشرکوں کی مقاومت نہیں کر سکتے تھے تو صبر کا حکم نازل ہوا، پھر جب وہ قوی ہو گئے تو انہیں جہاد کرنے کا حکم دے دیا گیا یہ دو حکم ہیں جو جس طرح پہلے درست تھے اب بھی ہیں۔ جس طرح قابل عمل پہلے زمانہ میں تھے اب بھی ہیں۔ تبدیل آیت بالآیت کی حقیقت یہ ہے، اور بس۔ کفار و مشرکین اس تنوع احکام کو برداشت نہیں کر سکتے، طعن و تشنیع کرنے بیٹھ جاتے ہیں، اور کہنے لگتے ہیں کہ آپ کبھی کوئی حکم دیتے ہیں اور کبھی کوئی حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے، اسے معلوم ہے کہ کب اور کس وقت کونسا حکم ہونا چاہیئے، اور کس وقت کونسا۔ پس دوسرے جواب کا لب لباب یہ ہے کہ آیت بالا میں جو حقیقت بیان فرمائی گئی ہے وہی مَا نَنسَخ والی آیت میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں نسخ بمعنی ازالۂ حکم مطلقاً پایا جاتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کے ماتحت جو تقریر کی ہے اُس سے بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے، فرماتے ہیں:۔

> جاننا چاہیئے کہ احکام شرعیہ میں نسخ کا حال احکام تکوینی میں نسخ جیسا ہے ؛ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام احکام الٰہیہ خواہ شرعی ہوں یا تکوینی لوح محفوظ میں موجود اور ثابت ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں، احکام خاص، احکام عام، پھر جو احکام خاص ہیں ان کی دو قسمیں ہیں وہ یا تو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہوں گے۔ اور یا کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص ہوں گے، خواہ وہ زمانہ قلیل ہو یا کثیر پس جو احکام کسی شخص کے یا زمانہ کے ساتھ

مخصوص ہوں گے وہ اس شخص اور زمانہ کے باقی رہنے تک باقی رہیں گے، احکام میں یہ تغیر و تبدل ہمارے اعتبار سے ہے ورنہ خدا کے نزدیک سب احکام برابر ہیں۔

ناسخ و منسوخ کی بحث یہاں ضمناً آگئی ورنہ دراصل اس بحث کے لئے مستقلاً ایک ضخیم کتاب درکار ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ وہ شخص جو فہم قرآن کی سعادت سے بہرہ اندوز ہونا چاہتا ہے اس کے لئے جس طرح یہ ضروری ہے کہ مفردات قرآن کی معانی کے تعیین کے لئے خود قرآن کی طرف رجوع کرے، اسی طرح استنباط احکام کے لئے ضروری ہے کہ کسی چیز کے متعلق قرآن مجید میں جتنے احکام آئے ہیں ان سب کو یکجا کر کے ان میں باہمی تناسب و توازن پیدا کرنے کی کوشش کرے اور یہ معلوم کرے کہ کونسا حکم کس زمانہ کے لئے تھا اور کونسا کس زمانہ کے لئے، ایک کا مورد و محل کیا ہے اور دوسرے کا کیا؟ ایک کا کیا منشا ہے اور دوسرے سے کیا مراد ہے قرآن مجید میں اگر غور کرنے والا احکام متنوعہ کے ان باہمی فروق کو نظر انداز کر کے ان میں ایک خاص توازن و تناسب پیدا کرنے کی کوشش نہیں کریگا تو قدم قدم پر اس کو مشکلات پیش آئیں گی، اور کہیں وہ "ناسخ و منسوخ" کہہ کر اپنی گلو خلاصی کا سامان کرے گا۔ اور کہیں ایسی رکیک تاویل و توجیہ کرے گا جو قرآن کے منشا کے برعکس ہوگی۔

تفسیر و تاویل کا فرق اس موقع پر ضروری ہے کہ تفسیر و تاویل کا فرق بھی معلوم کرلیا جائے۔ تفسیر "فسر" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی کھولنے اور بیان کرنے کے ہیں۔ اور "تاویل" کا مادہ اشتقاق ہے "اول" جس کے معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ "ایالت" سے مشتق ہے جس کے معنی سیاست ہیں۔ تاویل کرنے والا بھی چونکہ کلام کی سیاست سے واقف ہو کر اس کو اپنے موضوع و محل میں رکھتا ہے، اس لئے اس متکلم کو "موول" اور اس کے

تفسیر عزیزی - ۳۹۲

اس فعل کو "تاویل" کہتے ہیں۔ لیکن یہ وجہ ضعیف ہے۔ کما لا یخفی علی من لہ بصیرۃ فی مناہج استعمال الالفاظ ابو عبید اور ایک گروہ کا خیال تو یہی ہے کہ تفسیر و تاویل باعتبار معنی ایک ہیں لیکن در اصل یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن حبیب نیشاپوری بسبیل طنز کہتے ہیں:

"ہمارے زمانہ میں ایسے مفسر پیدا ہو گئے ہیں کہ اگر ان سے تفسیر و تاویل میں فرق دریافت کیا جائے تو وہ اس سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں"

امام راغب اصفہانی تفسیر و تاویل میں عام خاص مطلق کی نسبت بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تفسیر کا اطلاق بیشتر الفاظ و مفردات کلام پر ہوتا ہے، اور تاویل کا جملوں اور معانی پر۔ اور دوسرا فرق یہ بیان کرتے ہیں کہ تاویل عموماً کتب الٰہیہ میں ہوتی ہے اور تفسیر کتب الٰہیہ و غیر الٰہیہ دونوں میں لیکن ہمارے خیال میں زیادہ دلپسند اور صحیح فرق وہ ہے جو ابو طالب الثعلبی نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تفسیر کے معنی لفظ کی وضع کا بیان کر دینا ہے خواہ وہ حقیقت ہو یا مجاز۔ مثلاً "صراط" کے معنی راستہ "صیب" کے معنی بارش، اور "کفر" کے معنی انکار۔ اور تاویل کہتے ہیں باطنِ لفظ کی تفسیر کرنے کو۔ گویا تاویل کے معنی ہیں حقیقت مراد کی خبر دینا، اور تفسیر کے معنی ہیں دلیل مراد کی خبر دینا، کیونکہ لفظ کاشف مراد ہونے کے لحاظ سے دلیلِ مراد ہوتا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ اس کی تفسیر تو یہ ہے کہ "مرصاد" رصد سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں گھات میں رہنا اور نگرانی رکھنا، اس لئے مطلب یہ ہوا کہ تمہارا رب تمہارے اعمال کی دیکھ بھال رکھتا ہے۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ ہم کو برے اعمال سے بچنا چاہیئے اور احکام خداوندی کی تعمیل میں تکاسل و تہاون سے کام نہ لینا چاہیئے، بعض لوگوں نے اس مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ قرآن مجید میں جو چیز بیان کی گئی اور صحیح سنت میں جس کی تعیین کی گئی ہے اس کو ظاہر کر دینا تفسیر ہے۔ کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے ان میں کوئی جدت

پیدا کرے ورنہ وہ تفسیر بالرائے ہوجائیگی جس کی ممانعت کی گئی ہے اور تاویل ان احکام کو کہتے ہیں جن کا استنباط وہ علماء کرتے ہیں جو خطاب کے نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اور جو علوم وفنون میں مہارت تامہ رکھتے ہیں. علامہ لغوی وغیرہ نے تاویل کی تعریف یہ کی ہے

التاویل صرف الآیة الی معنیً موافق لما قبلها وما بعدها تحتمله الآیة غیر مخالف للکتاب والسنة من طریق الاستنباط (الاتقان فی علوم القرآن ج ۲ صفحہ ۱۸۳)	تاویل آیت کا لوٹا دینا ہے ایک ایسے معنی کی طرف جو ماقبل اور مابعد کے موافق ہو اور وہ معنی قرآن وسنت کے مخالف نہ ہوں اور ایسے معانی پیدا کرنا ازراہ استنباط ہوگا.

سطور بالا میں تفسیر و تاویل سے متعلق جو اقوال نقل کئے گئے ہیں ان سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ تفسیر کا دارومدار بڑی حد تک علم لغت، معانی اور ادب پر ہے. مگر تاویل یعنی قرآن مجید کی آیت کا صحیح مصداق متعین کرنے کے لئے صرف ان ہی علوم کی ضرورت نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ تاویل کرنے والا شریعت کے اسرار وحکم، رموز وغوامض اور اس کے احکام ومسائل سے پوری طرح واقف ہو اور استنباط مسائل کے جو اصول ہیں ان میں مہارت وکمال کا مرتبہ رکھتا ہو۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ شعراء فارس اپنے کلام میں تصوف کے مضامین کثرت سے بیان کرتے ہیں، لیکن بقول مرزا غالب ——

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یہ شعراء متصوفین شراب بولتے ہیں اور اس سے شراب معرفت. ساقی سے مرشد کامل اور شاہد سے شاہد حقیقی مراد لیتے ہیں، اس بناء پر جو شخص فارسی شاعری کی تاریخ، اس کی عہد بعہد ترقی اور شعراء کے اسالیب کلام سے واقف ہوگا اس کو شاعر کی صحیح مراد سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئیگی. اس کے برخلاف وہ شخص جو ان اسالیب سے واقف نہیں اور صرف زبانِ فارسی جانتا ہے وہ اشعار کا مطلب وہی سمجھے گا جو ان کے ظاہری ولغوی معانی سے مفہوم ہوتا ہے. پس اسی طرح در اصل تاویل

کا اہل وہی شخص ہے جو شریعت اسلام کے تمام سرچشموں سے باخبر ہے۔ اس کے بغیر اگر کوئی فہم قرآن کا ادعا کرتا ہے تو اس کا لغزشوں اور ٹھوکروں سے بچا رہنا نہایت مشکوک ہے، قرآن مجید میں ایک آیت ہے:۔

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم	وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے
بظلم اولئک لھم الامن وھم	ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، ان ہی کے
مھتدون۔ (الانعام)	لئے امن ہے اور وہ سیدھے راستہ پر ہیں۔

اس آیت میں جو لفظ "ظلم" آیا ہے اس سے معنی اگر لغوی مراد لئے جائیں یعنی وضع الشیء فی غیر محلہ تو ہر گناہ صغیرہ و کبیرہ اس کے ماتحت داخل ہو جاتا ہے، اور سوائے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کون ہے جس نے ایک مرتبہ بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا ہو تو اب اشکال یہ پیش آتا ہے کہ پھر اس آیت کے مصداق کون لوگ ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ظلم کے معنی لغوی مراد نہیں ہیں۔ اب لامحالہ ظلم کے معنی کی تعیین کرنے کے لئے آپ خود قرآن یا سنت کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ ایک روایت ملتی ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت نے اس آیت کو سن کر سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہ کیا ہو، آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد "شرک" ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ قرآن مجید کی فہم کا مرحلہ صرف لغت، ادب اور معانی و بیان کی روشنی میں کسی آیت کے مفہوم سمجھ لینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی حقیقی مراد و مصداق کو متعین کرنے کے لئے سخت ضرورت ہے کہ فہم قرآن کا طالب شریعت اسلام کے اصل سرچشموں سے کما حقہ واقف ہو، اور ان میں مبصرانہ نگاہ رکھتا ہو، اس واقفیت کے بغیر قرآن مجید کو سمجھنے کی سعی کرنا بالکل ایسا ہی ہے، جیسا کہ کوئی شخص امراء القیس کے اشعار جاہلیت کی تاریخ

معاشرت، تہذیب و تمدن، روایات، مزعومات و توہمات کو جانے پہچانے بغیر سمجھنا چاہیئے۔

کیا قرآن مجید بغیر سنت کے صحیح معنی میں سمجھ میں آسکتا ہے؟

ہندوستان میں اب ایسے حضرات کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جو مطالب قرآنی کے صحیح فہم کے لئے احادیث کے علم کو شرط قرار نہیں دیتے ان کی رائے میں احادیث ناقابل اعتبار و استناد ہیں اور اس بنا پر ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ تشریع احکام یا تفسیر قرآن میں ان سے مدد لیجا سکے، اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس خاص مسئلہ پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ کلام کیا جائے

سنت سے احتجاج کا انکار ہمارے دور نامسعود کی ہی خصوصیت نہیں بلکہ اس سے قبل بھی کچھ لوگ تھے جو سنت کو قابل احتجاج تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی نے نویں صدی ہجری کے آخر میں "مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ" نامی کتاب اسی طرح کے ایک منکر حدیث کے رد میں تصنیف فرمائی تھی جو مصر سے شائع ہو چکا ہے، لیکن زمانہ کے اوصاف و اطوار کے اختلاف کی وجہ سے ہمارے عہد میں اور اس عہد میں فرق یہ ہے کہ زمانۂ گذشتہ میں چونکہ ایمان کامل اور عقائد پختہ اور تمسک بالشریعت کا جذبہ مستحکم تھا، اس لئے منکر حدیث پر گوشۂ عافیت تنگ ہو جاتا تھا۔ اس کی صدا صدا بہ صحرا ہو کر گمنامی و عدم قبول کی فضاؤں میں گم ہو جاتی تھی اور عام مسلمانوں میں اس کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن آج ہمارے زمانہ میں حالات یہ نہیں ہیں۔ ایک شخص کھڑا ہو کر ڈنکے کی چوٹ احادیث نبوی کا انکار کرتا ہے، ان کی تشریعی و احکامی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ معاذ اللہ کتب حدیث کو "جھوٹ کا مواج دریا" کہتا ہے، ان کا استہزاء اور تمسخر کرتا ہے، سگرٹ کے پف ہوا میں اڑاتے اور اپنے ہونٹوں کو ایک اعوجاجی جنبش دیتے ہوئے ان پر پھبتیاں کستا ہے، اس کے باوجود اس کو لوگ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس کے مضامین کو رسالوں میں جگہ دیجاتی

ہے، اور اس کو "مجدد ملت" "محیی شریعت" کہہ کر پکارا جاتا ہے

"وائے گر در پسِ امروز بود فردائے"

دین میں مداہنت اور شریعت کی پابندیوں میں تساہل برتنے والی طبیعتیں اس کی آواز پر لبیک کہتی ہیں۔ اور اس طرح وہ چند برگشتہ دماغ نوجوانوں کا ایک حلقہ تیار کرلیتا ہے

قرآن میں اتباع رسول کا حکم

ان حضرات سے خود ان کے عقیدہ کے مطابق پہلی بات یہ دریافت کرنی چاہئے کہ قرآن مجید کو تو آپ قابل استناد اور اس کے احکام کو واجب الاتباع مانتے ہی ہیں۔ اب یہ ارشاد ہو کہ اس باب میں قرآن کا ایک ایک لفظ ایک ایک آیت سب برابر ہیں یا ان میں کوئی فرق ہے۔ نیز یہ کہ قرآن مجید میں جو اوامر و احکام ارشاد فرمائے گئے ہیں ان میں کیا بعض احکام ایسے بھی ہیں جن کا مصداق خارج میں موجود نہیں؟ اگر یہ فرمایا جائے کہ قرآن کی تمام آیات کا خارج میں مصداق موجود ہے اور وہ سب ہمارے لئے ضروری الاتباع ہیں، تو پھر ان آیات کی نسبت کیا کہا جائیگا۔ جن میں صاف طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے اور آپ کے اقوال و افعال پر عمل کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً آیات ذیل

(۱) فآمنوا باللہ و برسولہا — ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر

(۲) انما المؤمنون الذین آمنوا باللہ و رسولہ — مؤمن صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ "ایمان بالرسل" کے معنی کیا صرف یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا اقرار کرلیا جائے، اور آپ کے اقوال و افعال سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے اگر ایمان بالرسول کے معنی صرف یہی ہیں تو ایمان باللہ کے معنی بھی یہی ہونے چاہئیں کہ اللہ کی وحدت اور اس کی ربوبیت کا اقرار کرلیا جائے اور اس کے اوامر و نواہی کی پروا نہ کی جائے۔ ظاہر

ہے کہ جس شخص کو اسلام کے ساتھ دور کا بھی لگاؤ ہے وہ ایمان باللہ و بالرسول کے یہ معنی ہرگز مراد نہیں لے سکتا۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کو واحد و رب مطلق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق یقین کرکے دونوں کے اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہونے کا عہد و پیمان کرتا ہے۔ ورنہ اگر ایمان بالرسول سے صرف آپ کی رسالت کا اقرار کرنا مقصود ہوتا تو پھر آپ میں اور دوسرے انبیاء میں فرق کیا ہے؟ ان کی نبوت کا اقرار کرنا بھی تو آخر جزء ایمان ہی تو ہے۔ پس جس طرح ایمان باللہ کے معنی عمل بالقرآن کا عہد کرنا ہے، ٹھیک اسی طرح ایمان بالرسول کے معنی سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کا عہد ہوگا۔ اب اگر سنت قابل احتجاج و استناد ہی نہیں ہے تو پھر ایمان بالرسول کی حقیقت کس طرح متحقق ہوگی۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ قرآن مجید پر عمل کرنا ہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا ہے تو معلوم نہیں اس آیت کا کیا جواب دیا جائے گا جس میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان جتاتے ہوئے صاف طور پر فرمادیا ہے کہ رسول اللہ تمہارے پاس کتاب (قرآن مجید) اور حکمت لیکر آئے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ	اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ اس نے
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ	خود ان ہی میں سے ایک رسول پیدا کیا جو ان
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ	پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے ان کا
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ	تزکیہ کرتا ہے۔ ان کو کتاب اور حکمت کی
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ	تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے سے کھلی ہوئی
.. .. .. (آل عمران)	گمراہی میں تھے۔

یہ حکمت، کیا بعینہٖ کتاب ہے؟ اور کیا "حکمت" کا عطف "کتاب" پر عطف بیان ہی ہے؟ ارباب بلاغت جانتے ہیں کہ یہاں موقع عطف بیان کا ہے ہی نہیں کیونکہ یہاں احسان جتایا

جارہا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد اوصاف کو بیان کرنا مقصود ہے اگر کتاب اور حکمت سے ایک ہی چیز مراد لی جائے تو آنحضرت کے اوصاف میں ایک کمی ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ امام شافعی فرماتے ہیں " میں نے اُن بزرگ سے جو اہل علم ہیں، مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں" سنا ہے کہ اس آیت میں کتاب سے مراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے " پس اگر حکمت سے مراد غیر کتاب اللہ کوئی دوسری چیز ہے اور از روئے بلاغت حکمت سے کتاب اللہ مراد ہو ہی نہیں سکتی تو بتایا جائے وہ کہاں ہے اور کیا ہے؟ اور کیا وہ اقوال وافعال نبوئی کے سوا کوئی دوسری چیز ہو سکتی ہے ؟

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ	اے ایمان والو تم اطاعت کرو اللہ کی
وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ	اور اطاعت کرو اس کے رسول کی اور اپنے
مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ	اولی الامر کی ۔ اور اگر کسی بات میں جھگڑ
فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (النساء)	بیٹھو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو

اس آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے الگ الگ صیغۂ "اطیعوا" لایا گیا ہے ۔ لیکن " اولی الامر" کے لئے الگ کوئی صیغہ نہیں لایا گیا ۔ بلکہ اس کو صرف "رسول" پر معطوف کر دیا گیا ہے ۔ اس میں کیا خاص نکتہ ہے ؟ ہو سکتا تھا کہ صرف ایک "اطیعوا" بصیغہ امر لایا جاتا اور رسول اور اولی الامر دونوں کو اللہ پر معطوف کر دیا جاتا ۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ تینوں کے لئے الگ الگ تین صیغے " اطیعوا " کے لائے جاتے ، پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار نہیں فرمایا گیا اور اللہ اور اس کے رسول کے لئے تو جدا جدا " اطیعوا " ارشاد ہوا " اولی الامر " کے لئے نہیں ۔ اس میں نکتۂ بلیغ یہ ہے کہ قرآن مجید کو اصل میں دو مجموعہ قوانین کی طرف اشارہ کرنا ہے ۔ ایک وہ جو اللہ کی طرف منسوب ہو کر

"کتاب اللہ" اور دوسرا وہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو کر سنتِ رسول اللہ" کہلاتا ہے اور چونکہ اولی الامر (ان سے مراد حکام و ولاۃ ہوں یا علماء و مجتہدین) کی اطاعت کے لئے الگ کوئی مجموعۂ قوانین نہیں ہے بلکہ ان کی اطاعت کے احکام وہی ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ماخوذ ہیں اس بنا پر ان کے لئے الگ صیغۂ "اطیعوا" نہیں فرمایا گیا، چنانچہ آیت کا اخیر حصہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے، یعنی یہ کہ اگر تم آپس میں جھگڑا کرو۔ تم میں حاکم اور محکوم دونوں شامل ہیں۔ تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو، مطلب یہ ہے کہ ان سے فیصلہ طلب کرو۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہمارے لئے قابل احتجاج دو چیزیں ہیں، ایک اللہ کا فرمان، اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، اگر صرف اللہ کا فرمان یعنی "وحی متلو" ہی لائق استناد ہوتا تو "الرسول" فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ درحقیقت رسول کا فرمان بھی اللہ کا ہی فرمان ہے تب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اللہ کے ساتھ "رسول" کے ذکر کا سبب کیا ہے؟ پھر دیکھیے اس سے بھی زیادہ واضح طریقہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور آپ کے ارشاداتِ گرامی پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى	تیرے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ	مؤمن نہیں ہوں گے جب تک کہ یہ اپنے
لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا	اختلافات میں آپ کو حَکَم نہیں بنائیں گے
مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا	اور پھر اس کے بعد آپ کے حکم سے متعلق وہ
.. .. (النساء)	اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی محسوس نہیں کریں گے
.. ..	اور پورے طور پر اس کو تسلیم نہیں کرلیں گے

ایک مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر بیعت کرنے کو بعینہٖ خدا سے

بیعت کرنا فرمایا گیا ہے، اور جو لوگ بیعت رسول کے بعد خلاف عہد کریں اُن کے لئے سخت وعید اور جو اس کے مقتضا پر عمل پیرا ہوں اُن کے لئے بشارت اجر بیان کی گئی ہے۔

ارشاد ہے:-

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ	تحقیق وہ لوگ جو آپ کے ہاتھ پر بیعت
اللّٰہَ ط یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ فَمَنْ	کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ
نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ وَمَنْ	کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہی پھر جو کوئی قول
اَوْفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیْہُ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ	توڑتا ہے۔ وہ اپنے نقصان کیلئے توڑتا ہے
اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (فتح)	اور جو اس چیز کو پورا کرتا ہے جس کا اس نے اللہ
.. ..	سے اقرار کیا ہے، تو اللہ اس کو اجر عظیم عطا فرمائیگا

بخاری[1] میں حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت ہے کہ ایک انصاری نے حضرت زبیر سے درخت کو سیراب کرنے کے لئے پانی کے معاملہ میں جھگڑا کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو آپ نے حضرت زبیر سے فرمایا "تم اپنی زمین کو سیراب کرلو، اور اس کے بعد پانی اپنے پردیسی کے لئے چھوڑ دو، اس پر انصاری بولا "زبیر آپ کے پھوپی زاد بھائی ہیں نا"، یہ سن کر سرور کائنات کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور آپ نے فرمایا "اے زبیر! تم زمین کو سیراب کرو پھر پانی روکدو، یہاں تک کہ وہ دیواروں پر چڑھ جائے۔ زبیر نے فرمایا میں گمان کرتا ہوں کہ یہ آیت فلا وربک لا یؤمنون الایۃ اسی واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔

ان آیات سے یہ امر بالکل منقح ہوجاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی

---

[1] بخاری کتاب التفسیر سورۃ النساء

پر عمل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ قرآن پر لیکن فرق یہ ہے کہ قرآن نقلِ متواتر کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس بنا پر وہ قطعی الحکم والدلالۃ ہے۔ اور احادیث کا حال یہ نہیں ہے۔ اُن میں بہت کم ایسی حدیثیں ہیں جن کو متواتر کہا جاتا ہے۔ پس یہ فرق محض نقل کی قوت وضعف کی وجہ سے ہے۔ ورنہ اگر کسی حدیث کی نسبت کسی ذریعہ سے بالکل قطعی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ بعینہٖ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تو وجوب عمل کے اعتبار سے اس میں اور قرآن کی آیت میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ کیونکہ خود قرآن آپ کے متعلق شاہد ہے۔ وما ینطقِ عن الھویٰ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ۔

اس موقعہ پر یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ منکرینِ حدیث میں بعض لوگ ہیں جو حدیث کی تاریخی حیثیت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کو تشریع احکام میں مؤثر نہیں مانتے، آیت مذکورۂ بالا سے ان لوگوں کی بیّن طور پر تردید ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر "سنت" کی حیثیت محض تاریخی ہے تشریعی نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحکیم اور آپ کے فیصلہ کا واجب الطاعۃ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ پھر کس تاکید سے فرمایا گیا ہے کہ "تیرے رب کی قسم یہ مومن ہی نہیں ہوں گے جبتک کہ آپ کے فیصلہ کو بغیر کسی بددلی کے پورے طور پر تسلیم نہیں کرلیں گے"۔

اب دریافت طلب یہ ہے کہ یہ حکم آج بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبّہ تک کے لئے تھا۔ تو چونکہ آپ کی حیات میں وحی برابر نازل ہوتی رہتی تھی اور جو بات اہم پیش آتی تھی اس کا جواب قرآن سے مل جاتا تھا۔ اس لئے اسکی ضرورت ہی نہ تھی کہ آپ کو حکم بنانے اور آپ کے ارشادِ سامی کو تسلیم کرنے کا حکم دیا جاتا لا محالہ یہ ماننا پڑے گا کہ "ردوہ الی اللہ والرسول" اور آنحضرت صلعم کے فیصلہ کو بے چون وچرا تسلیم کرنے کا حکم آج بھی ایسا ہی موجود ہے جیسا کہ آپ کے عہد میں تھا اب سوال یہ ہے کہ اگر سنت کا

تمام ذخیرہ (معاذ اللہ) ناقابل احتجاج ہے تو پھر "قضاء رسول" کو ادنیٰ پس وپیش کے بغیر تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے کی صورت کیا ہے؟ اور نزاع برپا ہونے کے وقت "رد الی اللہ" کے ساتھ "رد الی الرسول" کیونکر ممکن ہے؟ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ علامہ ابن قیم کے بقول سنت کا تعلق قرآن کے ساتھ تین طرح کا ہے۔ ایک یہ کہ سنت قرآن کے ساتھ پورے طور پر موافق ہو تو اب اس صورت میں قرآن اور سنت کا ایک حکم پر توارد ایسا ہی ہے جیسا کہ مختلف دلیلوں کا کسی ایک مدعا کے لئے جمع ہو جانا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سنت میں اس چیز کا بیان ہو جو قرآن میں مذکور ہے اور اس کی تفسیر ہو، تیسری صورت یہ ہے کہ قرآن مجید جس حکم کے ایجاب یا تحریم سے خاموش رہا ہو اس کو سنت میں واجب یا حرام قرار دیا گیا ہو۔ علامہ ابن قیم ان تینوں صورتوں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ سنت ان تین اقسام سے خارج نہیں ہے۔ اس بنا پر اس کو قرآن کے ساتھ کسی قسم کا تعارض نہیں۔ پس جو سنت قرآن پر کسی طرح بھی زائد ہوگی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک مستقل تشریع ہے۔ اور اس کی اطاعت واجب اور معصیت حرام ہے۔ اور اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سنت کو کتاب اللہ پر تقدم حاصل ہے۔ بلکہ آپ کے ارشاد گرامی کی تعمیل تو بعینہٖ خدا کے فرمان کی بجا آوری ہے جو اس نے اپنے رسول کی اطاعت کے متعلق دیا ہے۔ اور اگر اس قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ کی جائے تو پھر آپ کی اطاعت کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے اور جو طاعت حضور کے ساتھ مختص ہے وہ کالعدم ہو جاتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت صرف احکام قرآنی میں ضروری قرار دیجائے اور جس حکم کے متعلق قرآن خاموش ہو اس کی اطاعت ضروری نہ ہو۔ تو مخصوص طاعت رسول باقی نہیں رہے گی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "من یطع الرسول فقد اطاع اللہ"

[1] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳۲)

جو محققین و مجددین " حدیث کو محض ایک تاریخی حیثیت دیتے ہیں اُنہیں آیت ذیل بار بار پڑھنی چاہیئے۔

لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضاً قد یعلم اللہ الذین یتسللون منکم لواذاً فلیحذر الذین یخالفون عن امرہٖ ان تصیبہم فتنۃٌ او یصیبہم عذابٌ الیم

تم رسول کے بلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا کہ تم میں کا ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو کترا کر نکلجاتے ہیں، وہ لوگ جو رسول کے امر سے اعراض کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیئے کہ کہیں انہیں کوئی فتنہ یا عذاب الیم نہ پہنچ جائے

آپ نے دیکھا! اس آیت میں کس وضاحت کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ کا ارشاد عام بات چیت یا اُن کے ملفوظات کی طرح نہیں ہے کہ ان سے محض تاریخ کا کام لیا جائے بلکہ وہ واجب الاتباع ہے اور یخالفون کے صلہ میں "عن" واقع ہو رہا ہے۔ اس لئے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ امر رسول سے کترا کر نکل جاتے ہیں اُن کو فتنہ یا شر پہنچنے کا اندیشہ ہے کہاں حدیث کی محض تاریخی حیثیت اور کہاں یہ تاکید اکید۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

ایک دوسری آیت ہے:۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم

اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ یاد داشت تاکہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کیلئے

یہاں "یاد داشت" سے مراد قرآن مجید ہے جو اممِ سابقہ کے شرائع و احوال کا محافظ انبیائے سابقین کے علوم کا جامع اور احکامِ الٰہی اور فلاحِ دارین کے طریقوں کو یاد دلانے والا ہے اس

آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔ حضور! آپ کا کام یہ ہے کہ تمام انسانوں کے لئے اس کتاب کے مضامین خوب کھول کھول کر بیان فرمائیں جو چیز قابل تشریح ہے اس کی تشریح فرمادیں جو مجمل ہے اس کی تفصیل کردیں۔ یہ آیت اس حقیقت پر دلیل قاطع ہے کہ آیات قرآنی کا وہی مطلب قابل اعتبار ہے جو حضور کی بیان فرمودہ حدیثوں کے مطابق ہو

ان آیات بنیات کے سوا ایک اور آیت ہے:۔

وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما	جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیں
نھٰکم عنہ فانتھوا[1]	اس کو لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ

اس آیت میں دو باتیں لائق توجہ ہیں۔ اول یہ کہ اس میں ما فرمایا گیا ہے جو عام ہونے کے اعتبار سے ہر اس چیز کو شامل ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو دیں خواہ وہ قرآن مجید ہو یا ارشادات نبوی۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کو قبول کرلیں اور پھر جس چیز سے آپ روکیں اس سے رک جائیں۔

---

[1] اس آیت کی وجہ سے بعض صحابہ تو فرمان رسول اللہ علیہ وسلم پر بھی کتاب اللہ کا اطلاق مجازاً کردیتے تھے بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ہاتھوں کو دنے اور گدوانے والی۔ اور بالوں کو نوچنے والی اور حسن کو نمایاں کرنے والی اور قدرتی پیدائش کی وضع کو بدلنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی۔ ایک عورت ام یعقوب کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ آئی اور کہنے لگی۔ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اس اس طرح لعنت بھیجی ہے، حضرت ابن مسعود نے فرمایا۔ میں کیوں اس شخص پر لعنت نہ بھیجوں جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملعون کیا ہو اور پھر وہ کتاب اللہ میں بھی ہو" عورت کہنے لگی" میں نے پورا قرآن پڑھا ہے لیکن مجھ کو تو کہیں پر لعنت کا حکم ملا نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو یہ ارشاد ضرور مل جاتا۔ کیا تم نے آیت وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا پڑھی ہے؟ ام یعقوب

ایتاء، اور نھی کی اسناد مجازی ہے یا حقیقی	دوسری بات یہ ہے کہ "اتی" اور "نھی" ان دونوں فعلوں کی اسناد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو رہی ہے۔ اب گفتگو یہ

ہو سکتی ہے کہ اسناد حقیقی ہے یا مجازی؟ اسناد مجازی کی صورت یہ ہو گی کہ دراصل "ایتاء اور نھی" کا فاعل یا مَا هُوَ لَهٗ تو ہے خداوند تعالیٰ لیکن مجاز عقلی کے متعدد علاقوں میں سے کسی ایک علاقہ کے متحقق ہونے کی وجہ سے فعل کی اسناد بجائے اللہ کے رسول کی طرف کر دی گئی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ یہاں اسناد حقیقی ہے اور اسناد مجازی ماننے کے لئے کوئی قوی وجہ موجود نہیں ہو اسکی دلیل یہ ہے کہ اس قسم کے موقع پر اگر کوئی بات بڑھا چڑھا کر پر عظمت طریقہ سے بیان کرنی منظور ہوتی ہے تو وہاں اسناد مجازی سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً آپ اگر جامع مسجد دہلی کی عظمت بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہیں گے " یہ مسجد شاہ جہاں بادشاہ نے بنائی ہے" پس اگر آیت بالا میں واقعی ایتاء اور نھی کا فاعل اللہ تعالیٰ ہوتا تو اس سے عدول کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی، بلکہ حکم کی عظمت اور اس کے قبول کرنے کو تاکید بیان کرنے کا مقتضیٰ یہ تھا کہ بجائے رسول کے اللہ کو ہی فاعل بنایا جاتا۔ کیونکہ "اللہ کا حکم" بہرحال، "رسول کے حکم" سے زیادہ عظمت رکھتا ہے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ بلکہ رسول اللہ کو دونوں فعلوں کا فاعل بنایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اتی اور نھی کی رسول کی طرف اسناد حقیقی ہے مجازی نہیں۔ اس بنا پر اب آیت کے صاف معنیٰ یہ ہو گئے کہ رسول اللہ بذات خود جو چیز تم کو دیں ان کو قبول کرو اور جس سے روکیں اس سے رک[1] جاؤ

---

[1] حضرت ابورافع کی ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں

بقیہ ملت" بولی ہاں! یہ آیت کو پڑھی ہے۔ ابن مسعود نے فرمایا۔ تو بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی نمود و نمائش اور زیبائش و آرائش سے منع فرمایا ہے (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الحشر)

خلاصہ یہ کہ اور اسی طرح کی متعدد آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے احکام کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت ضروری ہے۔ اب بحث یہ ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیات قطعی الثبوت اور قطعی الحکم ہیں یا نہیں ؟ اگر ہیں تو ان کا خارج میں کوئی مصداق موجود ہے یا نہیں ؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے ؟ اور کیا وہ سنت کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے ؟

یہاں تک جو گفتگو وہ قرآن مجید کی ان چند آیات کے پیش نظر تھی جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع اور آپ کے ارشادات گرامی پر عمل پیرا ہونے کا حکم تھا۔ اب آئیے یہ دیکھیں کہ قرآن مجید حقیقی طور پر سنت، کے بغیر سمجھ میں آبھی سکتا ہے یا نہیں اور اسکا صحیح مفہوم و مطلب بغیر سنت کے متعین ہو بھی سکتا ہے یا نہیں ؟

آیات قرآنی کا صحیح مفہوم سنت کے بغیر متعین نہیں ہو سکتا

اصل یہ ہے کہ اگر قرآن کو سمجھنے کی کوشش میں سنت سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے تو قرآن ——— مبہم اوامر و نواہی اور قصص کا ایک مجموعہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور اسلام کے مکمل و مفصل دستور اساسی ہونے کی حیثیت بڑی حد تک باطل ہو جائیگی مثلاً "اقیموا الصلوٰۃ" کے معنی و مصداق کی تحقیق میں اگر سنت سے مدد نہ لیجائے تو اس حکم کی تعمیل میں عجیب قسم کا انتشار نظر آئے گا۔ صلوٰۃ کے لغوی معنی دعاء یا عبادتگاہ ہیں۔ پس کوئی صاحب تو اس حکم کی تعمیل اس طرح کریں گے کہ دعاء مانگ لیا کریں گے اور اس کے لئے بھی کوئی خاص شکل اور کوئی خاص وقت نہیں۔ "وارکعوا مع الراکعین" کے ....

(حاشیہ ص۶۹) جو اپنے تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہو اور جب اس کے پاس کوئی ایسا حکم آئے جس میں میں نے کسی کام کے کرنے کا امر یا نہ کرنے کی نہی کی ہو تو وہ کہے کہ میں اسے نہیں جانتا میں تو وہی جانتا ہوں جس کو کتاب اللہ نے بیان کیا ہے (ابوداؤد) جامع ترمذی میں مقدام بن معدی کرب کی حدیث ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں تو صرف کتاب اللہ کے حلال و حرام کو ہی مانتا ہوں۔ خبردار ہو کہ جس کو رسول اللہ نے حرام کیا ہے وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کی طرح ہے۔ ان روایات میں حمار اہلی (گدھے) درندوں اور لقطہ معاہد کی حرمت کا ذکر ہے جسے ہم آگے تفصیل سے بیان کریں گے۔ انہی احادیث کے بعض طریقوں میں یہ الفاظ بھی ہیں الا من بلغہ عنی حدیث فکذب بہا فقد کذب اللہ ورسولہ والذی حدثہ یعنی اچھی طرح سن لو کہ جس کے پاس میری حدیث پہونچے اور اس کے باوجود وہ اسے جھٹلائے تو حقیقت میں اس نے اللہ تعالیٰ کو، اللہ تعالیٰ کے رسول کو اور اس کو جھٹلایا جس نے اس سے یہ حدیث بیان کی (مجمع الزوائد للہیثمی)

امر کی تعمیل میں بھی اسی طرح ہڑبونگ نظر آئے گی۔ رکوع کے معنی لغۃً مطلق انحناء (جھکنا) ہیں اب اگر رکوع کو اس کی حقیقت شرعیہ (جس کا ثبوت صرف سنت سے ملتا ہے) سے الگ کر لیا جائے تو یہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ وارکعوا مع الراکعین کے معنی کیا ہیں؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟ ایک صلوٰۃ و رکوع پر کیا موقوف ہے، زکوٰۃ، حج، اوقات و ارکان صلوٰۃ، ربوٰ وغیرہ کسی کی صحیح حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اور پورے قرآن کو پڑھنے کے بعد بھی عبادات و معاملات کا کوئی مکمل جامع نقشہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

حضرت عمران بن حصین رض کا استدلال

امام بیہقی نے اپنی سند سے شبیب بن فضالۃ المکی سے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ عمران ابن حصین رض نے چند لوگوں کے سامنے شفاعت کا بیان کیا، ایک شخص بولا۔ اے ابو نجید تم ہمارے سامنے وہ حدیثیں بیان کرتے ہو جن کی اصل ہم کو قرآن میں نہیں ملتی "عمران" یہ سن کر غضبناک ہو گئے اور آپ نے اس شخص سے فرمایا "تم نے قرآن پڑھا ہے؟" اس نے کہا۔ ہاں "فرمایا کیا تم نے قرآن میں کہیں یہ پڑھا ہے کہ عشاء کی فرض رکعتیں چار، مغرب کی تین، فجر کی دو، ظہر و عصر کی چار چار ہیں، بولا۔ نہیں" حضرت عمران بن حصین رض نے فرمایا۔ کیا ان سب رکعتوں کا علم تم نے ہم سے حاصل نہیں کیا۔ اور کیا ہم نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سیکھا ہے" پھر عمران بن حصین رض نے سوال کیا۔ کیا تمہیں قرآن میں کوئی ایسی آیت ملی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہو کہ چالیس بکریوں میں ایک بکری زکوٰۃ کی، اور اتنے اونٹوں میں ایک اونٹ، اور اتنے دراہم میں ایک درہم زکوٰۃ میں ادا کرنا ہوگا؟" اس شخص نے کہا نہیں" آپ بولے۔ کیا زکوٰۃ کی ان تمام مقادیر اور نصاب کا علم تم نے ہم سے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سیکھا ہے" اس کے بعد عمران نے فرمایا۔ "قرآن مجید میں ہے۔ ولیطوفوا بالبیت العتیق۔ تو کیا قرآن نے تم کو یہ بھی بتایا ہے کہ سات طواف کیا کرو، اور اس سے فارغ ہو کر "مقام ابراہیم" کے پیچھے دو رکعت

ادا کرو" پھر فرمایا کہ تم نے قرآن میں یہ بھی دیکھا ہے؟

لا جلب ولا جنب ولا شغار فی الاسلام (مشکوٰۃ شریف) اسلام میں نہ جلب ہے۔ نہ جنب اور نہ شغار[۱]

کیا تم نے سنا نہیں قرآن ہی خود کہتا ہے، وما اتٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا اس تقریر کے بعد عمران[۲] بولے یہ اسلامی احکام (جو عبادات و معاملات سے متعلق ہیں) سب کے سب ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لئے ہیں، اور یہ وہ چیزیں ہیں جن کا تم کو علم نہیں (یعنی قرآن مجید کی تلاوت کرنے کے باوجود[۳])

سنت اور لغت اگر فہم قرآن میں سنت سے مدد نہ لی جائے اُس سے نہ صرف یہ کہ منقولات شرعیہ (یعنی وہ الفاظ جو لغتاً کسی معنی میں مستعمل ہوئے تھے لیکن شریعت نے اُن کے معانی مخصوص و متعین کر دیئے ہیں مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، اعتکاف، طواف، وغیرہ) کو ہم نہیں سمجھ سکتے بلکہ لغت کی روشنی میں بھی بعض آیات کے مفہوم کو صحیح طور پر متعین نہیں کر سکتے[۳]۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام زباندان اور عربی فصاحت و بلاغت سے پورے طور پر واقف ہونے کے باوجود بعض آیات کا مطلب نہیں سمجھتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے۔ آیت حج "وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا" نازل ہوئی تو ایک صحابی نے دریافت کیا العامنا ھذا یا رسول اللہ الخ یہ حکم اسی سال کے لئے ہے یا ہر سال کے لئے؟ پھر آپ نے اس کی تشریح فرمائی

---

[۱] زکوٰۃ کی اصطلاح میں جلب اور جنب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے والا زکوٰۃ کے مویشیوں سے دور خیمے گاڑ کر زکوٰۃ دینے والوں کو اپنے پاس مویشیوں اور زکوٰۃ کی رقم کے لئے مجبور کرے۔ اور شغار کے معنے ہیں اپنی بیٹی کا دوسرے کے بیٹے سے اس شرط پر نکاح کرنا کہ وہ اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے بیاہ دے۔ اسلام میں دونوں باتوں کی ممانعت ہے [۲] مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ ص ۲۰۵۔

حکم بن آبان نے حضرت عکرمہؓ سے اُمّ ولد کے متعلق دریافت کیا، عکرمہ نے فرمایا وہ آزاد ہیں، حکم کہتے ہیں میں نے پوچھا کس حکم سے (یعنی یہ حکم کہاں ہے فرمایا قرآن ہیں، میں نے کہا قرآن کی کونسی آیت میں فرمایا یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم [۳] علامہ شاطبیؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں ونعلم بذلک ان بیان السنۃ ھو مراد اللہ تعالٰی من تلک الصیغ فاذا طرحت واتبع ظاہر الصیغ بمجرد الھویٰ صار صاحب ھذا النظر ضالا فی نظرہ جاھلا بالکتاب خابطا فی عمیاء الخ الموافقات فی اصول الشریعۃ ج ۴ ص ۲۰۔

کہ ایک شخص پر عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے۔ بشرطیکہ اس میں فرضیتِ حج کی شرائط پائی جائیں۔

تیمم سے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

فلم تجدوا ماء فتیمموا — اگر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم

صعیدًا طیبًا۔ — کرلو۔

تو صحابہ کرام کو واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ تیمم صرف وضو کی ضرورت کے وقت کے لئے ہے یا غسل ضروری کے لئے بھی۔ چنانچہ ایک صحابی کو سفر میں غسل کی ضرورت پیش آگئی اور وہاں پانی تھا نہیں انہوں نے اجتہاداً اپنے تمام بدن کا مٹی سے تیمم کرلیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فرمایا "جو تیمم وضو کا قائم مقام ہے، وہی غسل کا بھی قائم مقام ہے"

اس طرح کی بہتسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کا صحیح مفہوم متعین نہ فرمادیتے تو صحابہ کرام میں سخت اختلاف پیدا ہوجاتا اور قطعی طور پر انکے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہوسکتا

بعض دفعہ کلام کی مراد بجز مخاطب کوئی دوسرا متعین نہیں کرسکتا

پھر یہ حقیقت بھی نظرانداز نہ کرنی چاہئے کہ بعض اوقات کسی کلام کا صحیح مفہوم صرف مخاطب کے ذریعہ ہی متعین ہوسکتا ہے، مثلاً فرض کیجئے آپ اپنے کسی بیمار دوست کی عیادت کے لئے گئے ہیں اور اس سے مزاج کی کیفیت دریافت کرتے ہیں تو وہ اکتائے ہوئے لہجہ سے کہتا ہے۔ "اچھا ہوں" اس جملہ کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ اب وہ تندرست ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ بیمار دوست نے جو "اچھا ہوں" کہا تھا وہ کس لہجہ کے ساتھ کہا تھا اور اس بناء پر اس کا مطلب وہ نہیں ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہری طور پر متبادر ہوتا ہے، بلکہ دراصل مقصد یہ ہے کہ بیماری کو اتنا امتداد ہوگیا ہے کہ اب میں اپنے مرض کے متعلق کیا کہوں؟ بس یہی کہنا چاہیئے کہ اچھا ہوں۔

پس جب آپ روزمرہ کی گفتگو میں بعض جملوں کا مطلب ان کے ظاہر المعنی ہونے کے باوجود مخاطب کی امداد کے بغیر نہیں سمجھ سکتے تو قرآن مجید کو سنت سے الگ کر کے کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جبکہ یہ معلوم ہے کہ قرآن مجید تشریعِ احکام کی کتاب سماوی ہے۔ اور اس کا نزول ایک خاص ماحول میں وقت کے پیش آمدہ مسائل کے جواب میں ایک خاص قسم کی نفسیات وطبائع رکھنے والی قوم کی زبان میں نجماً نجماً ہوا ہے، اور جس میں اخلاق وکردار کی اصلاح کے نفسیاتی اصول کو کہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت نقل کی ہے۔ جس میں آپ فرماتے ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں نہ ہو لیکن بات یہ ہے کہ ہماری سمجھ اُس کے فہم سے قاصر ہے۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتا ہے:۔

لتبیّن للنّاس مانزّل الیہم (النحل)	تاکہ جو چیزیں آپ پر نازل کی گئی ہیں آپ لوگوں کے سامنے اُن کی تشریح کر دیں

امام شافعی فرماتے ہیں۔ سنتِ ثابتہ قرآن کے منافی نہیں بلکہ اس کے مؤید ہے اگرچہ قرآن میں سنت کے الفاظ کی نص صریح نہ ہو کیونکہ کوئی شخص قرآن کو ایسا نہیں سمجھ سکتا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو سمجھا ہے۔

حضرت مکحول الدمشقی فرماتے تھے:۔

القرآن احوج الی السنۃ من السنۃ الی القرآن [1]	قرآن کو سنت کی زیادہ احتیاج ہے بہ نسبت اسکے کہ سنت کو قرآن کی ضرورت ہو

یحییٰ بن ابی کثیر کہتے تھے:

[1] حافظ ابو عمر بن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مکحول کا مطلب ان الفاظ سے یہ ہے کہ کتاب اللہ کے لئے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبین ہے یعنی اس کی مراد واضح کرتی ہے انہا تقضی علیہ وتبین المراد منہ (جامع بیان العلم، ج ۲ ص ۱۹۱)

السنۃ قاضیۃ علی الکتاب و — سنت کتاب اللہ پر حکم کرنے والی ہے اور

لیس الکتاب قاضیا علی السنۃ — کتاب سنت پر حکم نہیں کرتی۔

اس سے اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیئے کہ سنت قرآن کے تابع نہیں اور قرآن سنت کے تابع[1] ہے۔ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی حیثیت متن کی اور سنت کی حیثیت شرح کی ہے۔ قرآن میں خفی بھی ہے مشکل اور مجمل بھی، سنت ان سب کا بیان کرتی ہے اور ان کی تفصیل کرتی ہے۔ اس بناء پر سنت سے جو کچھ سمجھ میں آتا ہے اس سے فہم قرآن میں مدد لیجا سکتی ہے، اور سنت چونکہ شرح کی حیثیت رکھتی ہے اور اس میں خفا، اجمال اور اشکال نہیں ہے اس لئے قرآن مجید کو اس کے لئے اصل تو کہا جائے گا مبیّن نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ جن لوگوں نے سنت سے قطع نظر کرکے عبادات کے اوقات اور ارکان، اور ان کے طریقے خود قرآن سے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے عجیب طرح کی مضحکہ انگیز تاویلوں سے کام لیا ہے۔ اور پھر بھی وہ عبادات کو اس منظم طریقہ پر قائم نہیں رکھ سکے جس پر اب تک امت مسلمہ کا عمل متواتر رہا ہے۔ اور اگر ان کی توجیہ و تاویل تعامل امت کے مطابق ہوتی بھی ہے تو وہ اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ سب کا اس پر متفق ہونا مشکل ہے۔ یہاں ہم صرف اس کی ایک مثال پر کفایت کریں گے۔

قرآن مجید میں اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ۔ فرما کر اس کا حکم دیا گیا ہے کہ جمعہ کے دن نماز کی اذان ہو تو اللہ کے ذکر کے لیئے دوڑو۔ اب اگر آپ سنت سے بالکل قطع نظر کرلیں تو محض اس آیت کو دیکھکر یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ حکم جمعہ کے دن کی کس نماز کے لیئے ہے۔ اور اگر جمعہ کی الگ کوئی نماز ہوتی ہے تو وہ کس وقت پڑھی جاتی ہے۔ ایک منکر حدیث کے سامنے اس کا ذکر آیا تو اس نے کہا کہ سنت سے استمداد کی ضرورت نہیں ہے، وذروا البیع تم بیع چھوڑ دو، اور وابتغوا من فضل اللہ "یہ دونوں ٹکڑے اس بات کی دلیل ہیں کہ جمعہ کی نماز ظہر کے وقت ہوتی

[1] امام احمد بن حنبل رح فرماتے ہیں "السنۃ قاضیۃ علی الکتاب" کی جگہ یوں تعبیر ہونی چاہیئے۔ ان السنۃ تفسیر الکتاب وتبیینہ (جامع بیان العلم ج ۲)

ہے کیونکہ بیع و شراء اور ابتغاء فضل اللہ یعنی رزق کے طلب کرنے کا وقت دوپہر کا ہی ہوتا ہے۔ اب غور کیجئے یہ توجیہہ کس قدر کمزور ہے، آپ تصور کیجئے اگر آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور مسلمانوں کا تعامل معلوم نہ ہوتا تو کیا اس وقت بھی محض وذروا البیع اور وابتغوا من فضل اللہ کو سامنے رکھ کر جمعہ کی نماز کا وقت قطعیت کے ساتھ متعین کر سکتے تھے اور کیا آپ کو یہ خیال نہ آتا کہ دوپہر کو لوگ عموماً آرام کرتے ہیں خرید و فروخت کا اور طلب رزق کا وقت صبح اور شام ہی ہے، جیسا کہ بالعموم ہندوستان میں دیکھا جاتا ہے۔

یہاں ہم نے صرف ایک مثال نقل کی ہے۔ سنت سے الگ رہ کر قرآن مجید سے آپ عبادات وغیرہ کی جو شکلیں، ارکان و آداب، اور اوقات و شرائط مستنبط کریں گے اون سب کا حال یہی ہوگا۔ اور آپ مسلمانوں کو کسی ایک قطعی الثبوت نظام کے ساتھ وابستہ نہیں کر سکینگے جس کے باعث ان میں گمرہی پھیلے گی۔ تشتت اور افتراق پیدا ہوگا۔ اور ان کا شیرازۂ جمعیت پریشان ہو کر رہجائے گا۔ اسی قسم کی گمراہیاں ہیں جن سے محفوظ رکھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

انی قد ترکت فیکم شیئین لن	میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جن کے
تضلوا بعدھما ابدا کتاب اللہ	بعد تم کبھی بھی گمراہ نہیں ہوگے۔ ایک کتاب اللہ
وسنتی ولن یفترقا حتی یردا علی	اور دوسری میری سنت، اور یہ دونوں حوض
الحوض۔ [1]	کوثر پر وارد ہونے تک ایک دوسرے سے جدا
.. ..	نہیں ہوں گے۔

مالک بن انس سے منقول ہے کہ سید کونین نے حجۃ الوداع میں فرمایا۔

امران ترکتھما فیکم لن تضلوا	دو امر ہیں جن کو میں تم میں چھوڑے جاتا ہوں

[1] مستدرک حاکم عن ابی ہریرۃ کتاب العلم ج ۱ ص ۹۳

ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ — جب تک تم ان سے تمسک کروگے گمراہ

نبیہ — نہیں ہوگے، ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت نبی

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام بعض اوقات کسی مسئلہ کی نسبت کوئی حکم صادر فرمادیتے تھے لیکن انہیں بعد میں معلوم ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فتوی اس کے خلاف ہے تو فوراً اس سے رجوع کرلیتے تھے۔ ایک مرتبہ بنو ثقیف کے ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا کہ بیت اللہ کی زیارت کرنے کے بعد اگر کسی عورت کو حیض آجائے تو وہ کوچ کرے یا نہیں، آپ نے فرمایا نہیں۔ اس پر ثقفی بولا کہ اس قسم کی ایک عورت سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آپ کے فتوے کے خلاف فتوی دیا تھا۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے اور ثقفی کو دُرّہ سے مار کر فرمایا:۔ "جس چیز کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتوی دے چکے ہیں۔ تم اس کے متعلق مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو"، حضرت عمرؓ فرماتے تھے "دیت عاقلہ کے لئے ہے اور کسی عورت کو شوہر کی دیت میں سے وراثت نہیں مل سکتی۔ ضحاک بن سفیانؓ نے انہیں بتایا کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو لکھا تھا کہ اشیم الضبی کی بیوی کو اس کی دیت میں سے حصہ دیدیا جائے حضرت عمر نے یہ سن کر اپنے قول سے رجوع کرلیا[1]۔

طاؤس بن کیسان بیان کرتے ہیں "ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں ایک ایسا آدمی چاہتا ہوں جس نے جنین کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم سنا ہو۔ یہ سن کر ایک صحابی کھڑے ہوئے اور بولے "میری دو بیویاں تھیں۔ ایک دن دونوں میں لڑائی ہوگئی۔ ایک نے خیمہ کا ڈنڈا اٹھاکر دوسری کے اس زور سے مارا کہ اس کے پیٹ کا بچہ مرا ہوا گر گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور کفارہ ایک رقبہ (باندی یا غلام) آزاد کرنے کا حکم دیدیا، حضرت عمرؓ نے

---

[1] معالم السنن ج ۴ کتاب الدیات ص ۱۰۵

فرمایا۔ اگر ہم یہ روایت نہ سنتے تو قریب تھا کہ اپنی رائے سے کام لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف کوئی حکم صادر کرتے۔"

صحابہ اگر کسی چیز پر عامل ہوتے اور ان کو معلوم ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل اس کے خلاف ہے تو فوراً اس سے تائب ہو جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ شام تشریف لیجا رہے تھے۔ مقام سرغ پر پہونچکر انہیں معلوم ہوا کہ وہاں وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اب آپ بڑے متردد ہوئے، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اگر کسی شہر میں وبا پھیلی ہوئی ہو تو وہاں مت جاؤ۔ اور اگر تم کسی شہر میں موجود ہو اور وہاں وبا پھیلنی شروع ہو جائے تو اس کے خوف سے بھاگو مت"۔ حضرت عمرؓ یہ روایت سن کر سرغ سے واپس تشریف لے آئے۔

کسی مسئلہ میں اگر انہیں شک ہوتا تھا تو خود اقدام نہیں کرتے تھے۔ پہلے اس کا حکم کتاب اللہ میں تلاش کرتے۔ اگر وہاں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس ایک عورت آئی جس کے نواسہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے حق وراثت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا "تمھارے لئے قرآن میں کوئی حکم نہیں ہے۔ اور جہانتک مجھ کو معلوم ہے سنت میں بھی کچھ نہیں ہے، اب تم چلی جاؤ، میں لوگوں سے دریافت کرلوں" آپ نے صحابۂ کرام سے استفسار کیا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے فرمایا۔ "میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا۔ آپ نے اسی طرح کے ایک معاملہ میں نانی کو چھٹا حصہ دلوایا تھا۔" حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا "تمھارا کوئی گواہ بھی ہے؟" محمد بن مسلمۃ الانصاریؓ کھڑے ہو کر بولے "میں ہوں"، اور انہوں نے وہی فرمایا جو حضرت مغیرہؓ نے کہا تھا۔ یہ سن کر آپ نے عورت کو سُدُس دیدینے کا حکم صادر کردیا۔[1]

---

[1] ابوداؤد کتاب الفرائض باب فی الجدۃ

ابن خزیمہ کہتے تھے "اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث ثابت ہو جائے تو اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو کچھ کہنا درست نہیں"[1] ہے۔

جو لوگ حدیث کو بھی نہیں مانتے وہ ائمۂ دین کے ان اقوال کو کیا مانیں گے۔ لیکن ہم نے ان کو اس غرض سے نقل کیا ہے کہ ان اقوال سے سنت کی اصل حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ہم نے (بجائے اس کے کہ سنت اور قرآن کے باہمی تعلق پر بحث کے لئے اپنے دلائل کے سلسلہ میں یہ چیزیں بیان کرتے) ان بزرگوں کے حوالہ سے انہیں بیان کر دیا ہے۔

صحابۂ کرام جو زبان داں ہونے کے باوصف درسگاہ نبوت سے براہ راست فیضیاب ہونے کا شرف رکھتے تھے، اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں مجمل ہیں کہیں ان آیتوں میں ظاہری اعتبار سے اشکال اور خفا پیدا ہو گیا ہے، اگر اس اجمال و خفا کو دور کرنے کیلئے سنت سے کام نہ لیا جائے تو ظاہر ہے کسی مکمل ضابطۂ احکام اور مجموعۂ قوانین کی ترتیب دشوار ہو جائے مثلاً قرآن مجید میں ہے اقیموا الصلوٰۃ نماز پڑھو۔ اٰتوا الزکوٰۃ زکوٰۃ ادا کرو السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما۔ احل اللہ البیع وحرم الربوا اللہ نے تمہارے لئے خرید و فروخت حلال کر دی اور سود کو حرام قرار دیدیا ہے۔ لیکن تمام قرآن میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ نماز کس طرح پڑھیں، اور اس کے ارکان کیا ہیں اور ان میں کیا ترتیب ہے؟ زکوٰۃ کس کس مال پر واجب ہے اور کتنی، چور کا ہاتھ کاٹنے کے لئے کوئی نصاب مقرر ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس میں بڑا اختلال لازم آتا ہے۔ کسی نے ایک پیسہ چرا لیا، اور اس کو دست بریدہ کر دیا گیا۔ اور اگر نصاب مقرر ہے تو وہ کتنا؟ پھر ایک چوری میں دونوں ہاتھ بیک وقت قطع کئے جائیں گے، یا ایک ہی ہاتھ کاٹا جائے گا، اور اگر ایک ہی ہاتھ قطع ہوگا۔ تو دایاں یا بایاں۔ اسی طرح قرآن نے بیع کو حلال اور ربوٰا کو حرام تو بتا دیا لیکن لغت میں ربوٰا کے

[1] یہ سب اقوال و روایات مفتاح الجنۃ، جامع بیان العلم جلد ثانی لابن عبد البر اور مفتاح السنہ للخولی سے ماخوذ ہیں۔

معنی صرف زیادتی کے ہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس زیادتی سے کیا مراد ہے؟ اور کس قسم کی اور کتنی زیادتی حرام ہے۔ اگر صرف قرآن پر ہی بایں معنی مدار شریعت ہے کہ احادیث کی بیان کی ہوئی تشریحات کو یک قلم نظر انداز کر دیا جائے اور الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی فرما کر جس دین کے اکمال کا مژدہ سنایا گیا ہے اگر اس کا منبع و مصدر صرف وہ قرآن ہے جس کے معانی و مطالب کی تفہیم میں صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو کوئی دخل نہ ہو تو ان تمام تنقیحات بالا کا جواب اس میں ہونا چاہیئے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس میں نہیں ہے، ہاں سنت کو قرآن کے لئے بیان و تفسیر یا تفصیل اجمال قرار دیا جائے اور دونوں کو ملا کر تشریع احکام کا منشاء کہا جائے تو بے شبہ قرآن مجید کا دعوی اتمام نعمت و اکمال دین درست ہے۔ اور خود قرآن مجید کی تصریحات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ سنت اس کے لئے بمنزلہ بیان و تشریح ہے۔ [عـه] آیت ذیل پر پھر غور کیجئے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس	ہم نے آپ پر نصیحت کی کتاب نازل کی تاکہ جو تعلیم لوگوں
ما انزل الیھم۔	کی طرف بھیجی گئی ہے آپ ان پر اسے اچھی طرح واضح کر دیں

دیکھیئے لتبین میں لام غایت کا ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن نازل کیا ہے اس کی غایت یہی ہے کہ آپ اس کو کھول کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کریں یعنی آپ ہی اس کے بہترین شارح، مفسر اور اس کے معانی و مطالب کو بیان کرنے والے ہیں۔ کوئی شخص فہم قرآن میں آپ سے اور آپ کی بیان فرمودہ تشریحات سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

مطرف بن عبد اللہ سے کسی نے کہا "تم ہم سے سوائے قرآن کے اور کچھ بیان نہ کیا کرو" فرمایا، بخدا ہم قرآن کے بدلہ کسی اور چیز کو تمہارے سامنے پیش نہیں کرتے، البتہ احادیث سنا کر اس ذات گرامی کا ارادہ کرتے ہیں جو ہم سب سے زیادہ عالم بالقرآن تھی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [ے]

[ے] جامع بیان العلم ج ۲ و موافقات امام شاطبی ج ۴ ص ۲۶

[عـه] حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں۔ والبیان منہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ضربین بیان المجمل فی الکتاب العزیز [۱۳] کالصلوات الخمس فی مواقیتها وسجودها ورکوعها وسائر احکامها وکبیانه للزکوٰة وحدها ووقتها وما الذی توخذ منه الاموال وبیانه لمناسک الحج قال صلی الله علیه وسلم اذ حج بالناس خذوا عنی مناسککم

لأن القرآن انما ورد مجملة فرض الصلوة والزکوة والحج دون تفصیل والحدیث مفصل۔ جامع بیان العلم وفضله ج ۲ ص ۱۹۰

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت سعید بن جبیرؓ کے ساتھ پیش آیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک حدیث بیان کی۔ ایک شخص بولا "قرآن مجید میں تو اس کے خلاف ہے" سعید بن جبیرؓ نے فرمایا:۔

"میں ایک حدیث بیان کرتا ہوں اور تم اس پر کتاب اللہ پیش کرتے ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری بہ نسبت کتاب اللہ کو زیادہ اچھی طرح جانتے تھے[1]"۔ (مسند دارمی)

قرآن کے اجمال اور سنت کی حیثیتِ تفصیل وبیان کی بناء پر صحابہ کرام سنت کے ساتھ بہت اعتنا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسی کے ذریعہ قرآن کی آیات کے صحیح معانی ومطالب متعین ہو سکتے ہیں۔ حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے تھے "عنقریب تمھارے پاس ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن مجید کے شبہات کے ساتھ تم سے مجادلہ کریں گے۔ تم ان پر سنن کے ذریعہ گرفت کرنا، کیونکہ اصحابِ سُنن کتاب اللہ کے بڑے عالم ہوتے ہیں[1]"۔ بعینہ یہی مقولہ لالکائی نے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے نقل کیا ہے۔

علامہ ابن سعدؒ نے "طبقات" میں بطریق عکرمہؒ حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ "حضرت علیؓ نے ان کو خوارج کے پاس بھیجا تو فرمایا "تم ان کے پاس جاؤ اور مباحثہ کرو مگر دیکھنا قرآن کو درمیان میں نہ لانا کیونکہ وہ معانی مختلفہ کو محتمل ہوتا ہے۔ البتہ — سنت سے احتجاج کرنا" ابن عباس نے فرمایا "میں تو ان کی بہ نسبت قرآن کو زیادہ جانتا ہوں، کیونکہ وہ ہمارے گھر میں ہی نازل ہوا ہے" حضرت علیؓ بولے "ہاں تم سچ کہتے ہو۔ لیکن القرآن حمّال ذو وجوہ قرآن میں (اجمال کی وجہ سے) مختلف معانی کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ تم بھی کہتے رہو گے اور وہ بھی کہتے رہیں گے، فیصلہ کچھ نہ ہوگا اس لئے سنن سے استدلال کرنا، وہ اس سے بچ کر کہیں نہیں جاسکیں گے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ

---

[1] موافقات امام شاطبیؒ ج ۴ ص ۱۰ وعن ابن مسعودؓ ستجدون اقواما یدعونکم الی کتاب اللہ نبذوہ وراء ظہورہم فعلیکم بالعلم وعن عمرؓ انما اخاف علیکم رجلین رجل یتاوّل القرآن علی غیر تاویلہ ورجل ینافس الملک علی اخیہ (ایضاً کتاب مذکور) ان آثار کو نقل کرنے کے بعد علامہ شاطبی فرماتے ہیں وھذا آثار فی ھذا المعنی حملھا العلماء ۳۴

علی تاویل القرآن بالرأی مع طرح السنن یعنی اس مضمون کے اور بہت سے آثار ہیں جن کا محمل علماء سلف کے یہاں یہ ہے کہ آیات قرآنی کے معنی سنن کو پس پشت ڈال کر اپنی رائے سے بیان کرنا

نے خوارج کے سنت کی روشنی میں مناظرہ کیا تو وہ لاجواب ہو گئے

دین کا مدار قرآن و سنت دونوں پر ہے

جیسا کہ ہم ابھی ضمناً اشارہ کر چکے ہیں در اصل دینِ الٰہی کا مکمل نقشہ قرآن و سنت کے امتزاج ہی سے سامنے آسکتا ہے۔ قرآن بطریق متن اور سنت بہ طور تفسیر و تشریح ہے، اور تشریع احکام کا مبنی دونوں ہیں، چنانچہ صحابۂ کرام و تابعین عظام بھی یہی سمجھتے تھے۔ اور ان دونوں پر ہی دین کا مدار رکھتے تھے۔ میمون بن مہران رح سے ایک روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رض کے پاس کوئی خصومت لے کر آتا تھا تو آپ قرآن میں اس کے لیے حکم تلاش کرتے تھے[ع]۔ اگر اس میں بھی انہیں کوئی حکم دستیاب نہیں ہوتا تھا تو لوگوں کو جمع کر کے وہ مسئلہ پیش کرتے اور ان سے پوچھتے کہ آپ کو اس مسئلہ کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ یاد ہے یا نہیں؟ وہ لوگ جواب اثبات میں دیتے تو آپ فرماتے

الحمد للہ الذی جعل فینا — تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہم میں دین

من یحفظ علینا دیننا — کی حفاظت کرنیوالے پیدا کیے اور انہیں باقی رکھا۔

جابر بن زید رح کہتے ہیں ایک مرتبہ طواف میں حضرت ابن عمر رض ملے فرمانے لگے "ابو الشعثاء تم تم فقہاء بصرہ میں سے ہو، بجز قرآن ناطق اور سنت صحیحہ کے کسی اور چیز سے فتوی نہ دینا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہو گے اور دوسروں کو بھی ہلاک کرو گے۔"

اسی طرح ابو سلمہ رح بصرہ میں تشریف لائے اور حسن بصری رح ان سے ملنے آئے تو آپ نے حضرت حسن سے فرمایا "مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتوی دیتے ہو، خبردار کبھی ایسا نہ کرنا۔ جب تک تمہارے پاس مسئلہ مستفتی بہ سے متعلق کوئی سنت یا قرآنی آیت نہ ہو۔"

سعید بن المسیب رح نے ایک شخص کو دیکھا کہ دو رکعتوں کے بعد بھی کچھ اور رکعتیں پڑھ رہا ہے اس شخص نے نماز سے فارغ ہو کر پوچھا "ابو محمد! کیا خدا مجھ کو اس نماز پر عذاب دیگا؟" فرمایا "نماز پر نہیں

ع اگر اس میں نہ ملتا تو سنت میں تلاش کرتے اور

بلکہ سنت کا خلاف کرنے پر" سعید بن جبیرؒ فرماتے تھے "کوئی قول بغیر عمل کے اور کوئی قول و عمل بغیر نیت کے مقبول نہیں ہوتا[ع] جبتک وہ سنت کے موافق نہ ہوں" حضرت حسن بصریؒ سے بھی اسی قسم کا ایک مقولہ مروی ہے۔

بہرحال اس طرح کے سینکڑوں آثار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سلف صالح نے دین قیم کی ہدایتوں کا مرکز قرآن و سنت دونوں کو ہی سمجھا۔ اور اس بنا پر جس طرح انہوں نے قرآن کی حفاظت اپنی جان فروشانہ قربانیوں سے کی۔ اور اس کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے خون کے آخری قطرہ سے بھی دریغ نہیں کیا۔ ٹھیک اسی طرح انہوں نے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حرز جان بنا کر رکھا اور اس کی حفاظت میں انسانی کوشش و سعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ فرمایا کرتے تھے۔ "اگر میری گردن پر تلوار رکھدی جائے اور مجھ کو یہ معلوم ہو کہ قتل ہونے سے پہلے ایک کلمہ بھی جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے لوگوں تک پہنچا سکتا ہوں تو میں اس امانت کو دوسروں تک ضرور پہنچا دونگا"

حضرت ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر رکھے تھے، ایک میں سوتے تھے اور ایک حصہ عبادت و تلاوت قرآن میں بسر کرتے تھے۔ اور ایک حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث یاد کرتے تھے۔ آج جبکہ بنا بنایا مکمل دین آپ کے پاس ہے آپ کو انکار حدیث کی جسارت ہوتی ہے لیکن اس وقت کا تصور کیجئے جبکہ آپ کے پاس ایک حدیث بھی نہ ہوتی، اور صرف قرآن مجید ہوتا تو کیا اس وقت بھی یہ دین برحق اپنی اس صورت میں آپ کو نظر آسکتا تھا؟

ع اور قول و عمل اور نیت اس وقت تک مقبول نہیں ہوتے

ع جرمن کے مشہور و معروف عربی داں فاضل ڈاکٹر اسپرنگر نے الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ "کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے۔ جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جسکی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے"

حدیث کی تشریعی حیثیت اور اُس سے غرض

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم نے حدیث کی تشریعی حیثیت کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس کو آیات بیّنات سے ثابت کر چکے ہیں لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ تشریع کے باب میں قرآن و حدیث دونوں ایک پلّہ کے نہیں ہیں۔ قرآن قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ والحکم ہے اور حدیث ظنی پھر دونوں قوت و حکم کے اعتبار سے یکساں کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اس بناء پر اگر کوئی حدیث قرآن مجید کے کسی قطعی حکم کے خلاف ہو تو اس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ سند و الفاظ حدیث کے لحاظ سے اس میں متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اور وما اٰتٰکم الرسول فخذوہ دیکھکر یہ شبہ ہو گیا ہے کہ قرآن کی طرح سنت بھی تشریع میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ یہ خیال درست نہیں کیونکہ قرآن مجید نے ہی خود اس کی بھی تصریح کی ہے کہ

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوحٰى — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ وہ نازل شدہ وحی ہوتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل وحی (قرآن) ہے اور نطق نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام اس سے نکلی ہوئی فرع، اس بناء پر لامحالہ نطق گرامی وحی متلو کے مطابق ہوگا۔ بالفرض اگر دونوں میں مطابقت کی کوئی صورت نہ ہو تو حدیث کو ترک کرنا پڑے گا۔ لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ قرآن کے ایک حکم ظاہر الدلالۃ سے متعارض ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس قول کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف انتساب ہی نادرست ہے۔

پس سنت کی تشریع سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی طرح اس باب میں مستقل حیثیت رکھتی ہے، بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ سنّت وحی الٰہی کے لئے بمنزلہ بیان اور تفصیل کے ہے۔

اگر کسی صحیح الثبوت سنت سے کوئی ایسا حکم ملے جس کے متعلق قرآن میں سکوت ہو یا اس کے کسی ایک ہی پہلو کو بیان کیا گیا ہو، یا اس حکم کے بیان میں کسی قسم کا کوئی اشکال و خفا رہ گیا ہو تو قرآن و سنت دونوں کو ملا کر ایک حکم مفصل کا استنباط کیا جائے گا۔ اور اس وقت قرآن کی حیثیت متن کی اور سنت کی حیثیت شرح کی ہوگی۔ اب ہم ذیل میں اس کی چند مثالیں لکھتے ہیں تاکہ تشریع بالسنت کی حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

۱- قرآن میں صرف نماز کا حکم ہے لیکن رکعات کی تعداد نہیں بتائی گئی۔ سنت نے ان کو بیان کر دیا ہے۔ اگر کوئی شخص مغرب میں دو۔ فجر میں تین۔ ظہر عصر اور عشاء میں پانچ یا دو دو اور تین تین رکعتیں پڑھے گا تو اس کی نماز بالکل نہیں ہوگی اور وہ نہ صرف سنت کا مخالف کہا جائے گا بلکہ قرآن کا بھی۔

۲- قرآن نے صرف اتنا بتایا ہے کہ نکاح حلال ہے اور زنا و سفاح حرام، لیکن نکاح مشروع کے علاوہ نکاح غیر مشروع کون کون سے ہیں قرآن میں ان کا تفصیلی ذکر موجود نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں ہے

ایما امرأۃ نکحت بغیر اذن ولیھا	جس عورت نے بغیر اجازت ولی کے نکاح کر لیا
فنکاحھا باطل[1]	اس کا نکاح باطل ہے۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ عورت سے باکرہ ثیبہ دونوں مراد ہیں یا ایک اور ولی کون ہے اور ولایت کا مبنیٰ خیار بلوغ پر ہے یا بکارت پر۔ کہنا یہ ہے کہ آپ اس حدیث کو نظر انداز نہیں کر سکتے قرآن مجید نے نکاح کو اجمالاً بیان کیا ہے۔ احادیث صحیحہ میں نکاح کے جو شرائط صحت وغیرہ تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ان کو قرآن کے ساتھ ملا کر ایک مکمل قانون نکاح تیار کرنا ہوگا۔

۳- قرآن میں صرف ربوا کی حرمت کا ذکر ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ ربوا سے مراد کیا ہے؟

---

[1] ترمذی شریف باب ماجاء لا نکاح الا بولی

اور اس کی حرمت کا مدار کس چیز پر ہے؟ حدیث نے اس سوال کا جواب دیا ارشاد نبویؐ ہے

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواءٍ یداً بیدٍ او الفضل ربوا

بیچو سونے کو سونے کے بدلے میں، چاندی کو چاندی کے، گیہوں کو گیہوں کے، جو کو جو کے، کھجور کو کھجور کے اور نمک کو نمک کے بدلے میں جنس بجنس برابر برابر، دست بدست اور زیادتی ربوا ہے

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ قرآن مجید میں جو لفظ ربوا آیا ہے اس سے مراد کیا ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ حدیث سے بھی پوری تفصیل اس لئے سمجھ میں نہیں آتی کہ اس میں حرمت ربوا کے منشار کی جزوی طور پر تعیین نہیں کی گئی یہی وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد کی روشنی میں علت حرمت کی تشخیص فرمائی یعنی الفاظ حدیث میں اس کی تصریح نہیں کہ حرمت ربوا کا مدار جنسیت اور تفاضل دونوں پر ہے یا صرف ایک پر یا از قسم کیلات وموزونات ہونے پر۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ؏ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے تشریف لے گئے اور ہم پر ربوا کی حقیقت مکمل طور پر واضح نہیں ہوئی " تاہم غور کیجئے اگر یہ حدیث نہ ہوتی تو کیا آپ محض الفاظِ قرآنی سے ربوا کی حقیقت کسی درجہ میں بھی سمجھ سکتے؟ یقیناً نہیں۔ پس ربوا کے متعلق جو احکام وضع کیے جائیں گے ان کے لئے قرآن کو اصل اور حدیث کو اس کا بیان قرار دے کر کیے جائیں گے۔

۴۔ قرآن مجید میں دو بہنوں کو نکاح میں بیک وقت جمع کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ صاحب قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اس تحریم کی وجہ یہ ہے کہ:۔

دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر دینے سے قطع صلۂ رحم لازم آجاتا ہے جو اللہ کے نزدیک انتہائی مبغوض اور قبیح چیز ہے۔ اس کے علاوہ بھانجی اور خالہ، بھتیجی اور پھوپی ان دونوں کو اگر نکاح میں جمع کیا جائے تو اس سے بھی قطع رحم لازم آتا ہے اس بنا پر آپ نے ان کو نکاح میں جمع کرنے کی

؏ صحیح مسلم ودیگر کتب صحاح (باب الربوا)

حرمت کا بھی اعلان فرمادیا۔ آپ کے اس فرمان کو معاذ اللہ حکم قرآن کے خلاف نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کی تعبیر یوں کی جائے گی کہ قرآن مجید نے جمع بین الاختین کا ذکر کر کے صرف حکم حرمت کی علت کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس سے مقصد یہ نہیں ہے کہ حرمت جمع کا حکم صرف ایک ہی صورت تک محدود رکھا جائے اس لئے آپ کو بحیثیت شارع اسلام ہونے کے اس کا حق ہے کہ قرآن کی اس اصل کی روشنی میں دو بہنوں کے علاوہ بھانجی اور خالہ بھتیجی اور پھوپی کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی حرمت کا بھی اعلان فرمادیں۔

ان چند مثالوں سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ ہم حدیث کی تشریعی حیثیت سے کیا مراد لیتے ہیں یعنی جب ہم کسی چیز کے متعلق احکام وضع کرنا چاہتے ہیں تو قرآن مجید کو اصل قرار دے کر احادیث کا تتبع کرتے ہیں اور پھر دونوں کی تطبیق سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔ نہ یہ کہ سنت کو مستقل تشریعی حیثیت حاصل ہے۔ اور قرآن مجید سے قطع نظر کر کے صرف سنت سے استخراج احکام کیا جا سکتا ہے علامہ ابو اسحاق الشاطبی متوفی ۷۹۰ھ نے "الموافقات" کی جلد چہارم میں صفحہ ۱۳ سے صفحہ ۳۰ تک اس پر مفصل بحث کی ہے کہ سنت کو کتاب اللہ سے منطبق کرنے کی کتنی صورتیں ہیں اور اس ذیل میں مختلف مذاہب بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"سنت میں جو معانی اور احکام تفصیلیہ پائے جاتے ہیں وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن وہ صرف ان ہی لوگوں کو معلوم ہو سکتے ہیں جو قرآن میں تفقہ تام رکھتے ہوں اور اس میں تدبر کرتے ہوں اگرچہ وہی معانی اور احکام سنت میں زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ملیں گے۔"

تدوین حدیث

گذشتہ بحث سے یہ امر بایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے کہ قرآن مجید کے فہم میں حدیث سے مدد لینا ناگزیر ہے، اب ہم تدوین اور صحت حدیث پر ایک تاریخی نظر ڈالکر بتانا چاہتے ہیں کہ روایت، اسناد، اور درایت کے لحاظ سے حدیث کا مرتبہ کس قدر بلند ہے تاکہ منکرین حدیث کو اپنے دلائل پر غور کرنے کا موقع ملے۔

عہد نبوت اور تدوین حدیث یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں حدیث لکھنے کا اتنا اہتمام نہیں کیا گیا جتنا کہ قرآن مجید کے لکھنے کا کیا گیا بلکہ بعض احادیث سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتابت حدیث کی ممانعت کر رکھی تھی۔

حضرت ابوسعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لاتکتبوا عنی ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا عنی فلا حرج ومن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار	تم میری احادیث نہ لکھو اور جو شخص قرآن کے علاوہ میری حدیثیں لکھتا ہو اُس کو چاہیئے کہ انہیں مٹادے ہاں میری حدیث بیان کیا کرو اس میں کچھ حرج نہیں ہے اور جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ باندھے اس کو اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لینا چاہیئے۔
.. .. (صحیح مسلم) ..	
.. ..	

اسی کے ساتھ بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض خاص خاص ارشادات نبوی تھے جنہیں آپ نے خود قلمبند کرایا یا کسی نے انہیں خود قلمبند کرنا چاہا تو آپ نے اس کی ممانعت

نہیں فرمائی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ خزاعہ کے آدمیوں نے فتح مکہ کے سال بنولیث کے کئی ایک آدمی کو اپنے ایک مقتول کے بدلہ میں قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ اپنی سواری پر سوار ہوئے اور حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا۔

"اللہ نے مکہ میں قتل کرنے کی ممانعت کر دی ہے۔ اور مکہ پر رسول اللہ اور مؤمنین مسلط کر دیئے گئے ہیں۔ یہ نہ مجھ سے قبل کسی کے لئے حلال تھا اور نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہے۔ ہاں! یہ دن میں صرف ایک ساعت کے لئے حلال تھا۔ لیکن اب اس وقت قتل و قتال حرام ہے۔ نہ تو یہاں کا کانٹا کاٹا جا سکتا ہے اور نہ یہاں کے کسی درخت کو قطع کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ یہاں کوئی پڑی ہوئی چیز اٹھائی جا سکتی ہے۔ صرف وہ اٹھا سکتا ہے جس کی چیز گم ہو گئی ہو اور وہ اسے ڈھونڈھنے نکلا ہو۔ اور جس شخص کا کوئی آدمی قتل کر دیا گیا ہو اس کو اختیار ہے چاہے مقتول کے بدلہ میں دیت لے یا قصاص"

اتنے میں ایک یمنی شخص آیا۔ اور اس نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ میں لکھ لوں (یعنی آپ کا یہ خطبہ) آپ نے فرمایا۔ "ابوفلاں" کے لئے لکھ دو[1]

(محدثین نے ان دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح پیدا کی ہے کہ آپ نے جس زمانہ میں کتابت حدیث کی ممانعت فرمائی تھی۔ وہ نزول وحی کا زمانہ تھا۔ اگر قرآن مجید کی طرح حدیث کی کتابت کا بھی اہتمام کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ دونوں میں التباس واقع ہو جائے۔ پھر جب التباس کا اندیشہ جاتا رہا تو آپ نے لکھنے کی اجازت دیدی۔ بہرحال یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] بخاری کتاب الدیات باب من قتل"

کے عہد مبارک میں آپ کے اقوال و افعال کو قلمبند کرنے کا اہتمام نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی وفات کے بعد صحابۂ کرام کے پاس بجز قرآن کے کوئی دوسرا صحیفہ نہیں تھا۔ کسی ضرورت کے وقت اگر وہ کوئی حدیث بیان بھی کرتے تھے تو اپنے حافظہ سے بیان کرتے تھے

حافظ ذہبی نے حاکم سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ جس میں پانچسو احادیث تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک شب حضرت عائشہؓ نے انہیں دیکھا کہ کرب و اضطراب سے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ انہیں اس سے رنج ہوا۔ پوچھا "آپ کو کوئی تکلیف ہے؟" صبح ہوئی تو فرمایا "بیٹی! احادیث کا جو مجموعہ تمہارے پاس ہے ذرا اسے لانا"، حضرت عائشہ نے اسکو پیش کیا۔ آپ نے آگ منگا کر اسے جلا ڈالا۔ وجہ پوچھی گئی تو فرمایا "میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مرجاؤں اور یہ مجموعہ میرے پاس ہو۔ اور اس میں ایسے شخص کی احادیث بھی ہوں جس کو میں نے ثقہ سمجھا ہو۔ اور وہ دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہ ہوں تو اس کی نقل کی ذمہ داری مجھ پر ہی ہوگی۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ خود حافظ ذہبی اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں فھذا لا یصح[1] یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

بعض خاص صحیفے بخاری کی ایک روایت سے صرف حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث کی کتابت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جو کثرت روایت میں مشہور تھے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بجز عبداللہ بن عمر کے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا وہ احادیث قلمبند کرتے تھے اور میں ان کو زبانی یاد رکھتا تھا[2]۔ بعض حفاظ نے لکھا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے علم الفرائض میں کوئی کتاب لکھی تھی[3]۔ لیکن اصل یہ ہے کہ عہد صحابہ میں جن صحیفوں کا ذکر ملتا ہے وہ زیادہ تر زکوۃ وغیرہ کے خاص خاص احکام سے متعلق تھے۔ ورنہ پہلی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۵ [2] بخاری باب کتابت العلم [3] توجیہ النظر الی اصول الاثر ص ۸۔

صدی ہجری کے ختم تک نہ باقاعدہ تدوین حدیث کی طرف توجہ کی گئی اور نہ کہیں اس کا اہتمام کیا گیا۔ ابوجحیفہ روایت ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا۔

"ھل عندکم کتاب"	کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے۔
فرمایا ـــ "لا الا کتاب اللہ او فہم اعطیہ	نہیں صرف کتاب اللہ ہے یا وہ سمجھ
رجل مسلم او مافی ھذہ	جو کسی مسلمان کو عطا کی گئی ہو۔ یا
الصحیفۃ"	وہ جو اس صحیفہ میں ہے۔

ابوجحیفہ نے پوچھا "اس میں کیا ہے ؟" بولے "العقل وفکاک الاسیر ولا یقتل مسلم بکافر[۱] یعنی دیت کے اور قیدی کو رہا کرانے کے احکام اور ایک یہ حکم کہ کوئی مسلمان کسی کافر کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے۔ غرضکہ پہلی صدی ہجری تک یہی حال رہا[۲]

تحریک تدوین حدیث جب عمر بن عبدالعزیز سریرآرائے خلافت ہوئے اور آپ نے دیکھا کہ جن بزرگوں کے سینوں میں اقوال وافعال نبوی کا ذخیرہ موجود ہے۔ یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے جارہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی نسلیں ان سرچشمہائے سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں۔ تو آپ نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو لکھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث اور سنت آپ کو ملے اس کو لکھ لیجیئے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم مٹ نہ جائے اور علما فنا نہ ہو جائیں۔ اور تم صرف وہی کہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے اور علم کو پھیلنا چاہیئے۔ اور آپس میں مجالست کرو تاکہ جو شخص نہیں جانتا وہ بھی جان جائے"[۳]

---

[۱] بخاری باب کتابۃ العلم۔ [۲] ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے دوسرے اجلاس منعقدہ لاہور میں ڈاکٹر زبیر صدیقی کلکتہ یونیورسٹی نے "تدوین حدیث عہد نبوت میں" کے عنوان سے انگریزی زبان میں ایک نہایت محققانہ اور قابل قدر مضمون پڑھا تھا۔ جو ادارہ کی رپورٹ میں شائع ہو چکا ہے اس میں موصوف نے یہ ثابت کر دیا کہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹۲ پر دیکھئے)

ابوبکر بن محمد انصار مدینہ میں سے تھے۔ سلیمان بن عبدالملک اور عمر بن عبدالعزیزؒ کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔ ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز ۹۹ھ رجب ۱۰۱ھ تک خلیفہ رہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تدوین حدیث کی تحریک ۱۰۰ھ کے لگ بھگ شروع ہو گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات کے باعث اس وقت بھی تدوین کا کام انجام نہیں پا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ابوبکر بن محمد کے مجموعہ احادیث کے وجود کا پتہ اب تک کہیں نہیں مل سکا ہے۔ اور نہ جامعین حدیث میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا ہے

اس بنا پر بعض مستشرقین نے اس روایت کو تسلیم کرنے سے بالکل انکار ہی کر دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ روایت سے صرف حضرت عمر بن عبدالعزیز کا جمع احادیث کی طرف متوجہ ہونا اور ابوبکر بن محمد کو اس کے لئے حکم کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس حکم کی تعمیل میں احادیث جمع بھی کر دی گئی تھیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اگر مسموم ہونے کے باعث حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اچانک وفات نہ ہو جاتی تو آج ہمارے پاس سب سے قدیم مجموعۂ احادیث موجود ہوتا۔

درس حدیث دوسری صدی ہجری کے نصف اول تک احادیث اسی طرح زبانی منقول ہوتی رہیں۔ مدینہ، بصرہ، کوفہ، شام میں درس حدیث کے مستقل مراکز قائم تھے۔ جنہوں نے حضرت عکرمہ مولیٰ ابن عباس نافع مولیٰ ابن عمر۔ سعید بن جبیر۔ مجاہد بن جبیر۔ طاؤس بن کیسان۔ شہاب الدین زہری۔ امام نخعی وغیرہ ایسے ائمہ۔ حدیث و ارباب علم فضل پیدا کئے۔

کوشش کی ہے کہ درحقیقت تدوین احادیث کا کام سرکار رسالتمآبؐ کے عہد میں ہی شروع ہو گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہم پورے مضمون کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتے۔ موصوف جن کو مجموعہ ہائے احادیث کہتے ہیں وہ دراصل صحف تھے جن میں بعض خاص خاص احکام درج تھے۔ بخاری کتاب العلم کیف یقبض العلم

عہد بنی عباس میں تدوین حدیث کا آغاز

بنو عباس کے عہد حکومت میں جب علم و فن کا چرچا عام ہوا اور علوم و فنون کی تدوین شروع ہوئی تو علماء اسلام نے سب سے پہلے مختلف شہروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور آپ کی سیرت مقدسہ مدون کرنے کی طرف توجہ مبذول کی چنانچہ مکہ میں ابن جریج المتوفی ۱۵۰ھ نے۔ مدینہ میں محمد بن اسحاق (۱۵۱ھ) اور امام مالک بن انس (۱۷۹ھ) نے بصرہ میں ربیع بن صبیح (۱۶۰ھ) سعید بن عروبہ (۱۵۶ھ) اور حماد بن سلمہ (۱۷۶ھ) نے کوفہ میں سفیان الثوری (۱۶۱ھ) نے شام میں امام اوزاعی (۱۵۶ھ) نے۔ یمن میں معمر (۱۵۳ھ) نے۔ خراسان میں عبداللہ بن المبارک (۱۸۱ھ) نے۔ اور مصر میں لیث بن سعد (۱۷۵ھ) نے الگ الگ مجموعہائے حدیث مدون کیئے۔ ابن جریج کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوگئی تھی اس لئے غالب یہ ہے کہ اس کار خیر میں سبقت کا سہرا انہیں کے سر ہوگا[1]

ان ائمہ حدیث نے یہ مجموعے اس جذبہ کے ماتحت مرتب کیئے تھے کہ علماء کرام فنا ہو رہے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ علم بھی بالکل فنا ہو جائے۔ اس لئے انہوں نے ان کتب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے ساتھ صحابۂ کرام کے اقوال اور تابعین کے فتاوے بھی شامل کر دیئے۔ ان مجموعوں میں سے آجکل صرف موطا امام مالک پایا جاتا ہے جس کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جامعین حدیث نے اقوال صحابہ کی حفاظت میں بھی وہی اہتمام کیا جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی تدوین و حفاظت میں کیا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے ختم پر بعض ائمہ کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو اقوال صحابہ اور فتاوی تابعین سے الگ کر کے ایک علیحدہ مجموعہ میں محفوظ کر دینا چاہیئے

---

[1] ضحی الاسلام ج ۲ ص ۱۰۷

چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر متعدد علماء نے مسانید لکھیں جن میں مشہور یہ ہیں۔ عبید اللہ بن موسیٰ العبسی الکوفی، مسدد بن مسرھد البصری۔ اسد بن موسیٰ الاموی۔ نعیم بن حماد الخزاعی نزیل مصر، ان کے نقش قدم پر دوسرے علماء اعلام بھی چلے اور انہوں نے بھی مسانید لکھیں اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبل۔ اسحاق بن راھویہ اور عثمان بن ابی شیبہ[1] کے اسماء گرامی زیادہ نمایاں ہیں

کتب حدیث کی ترتیب میں اختلاف

سب سے پہلے حدیث کے جو مجموعے مرتب ہوئے ان کی ترتیب ابواب فقہ کے مطابق رکھی گئی تھی۔ مثلاً کتاب الطہارۃ لکھ کر ایک عنوان مقرر کر دیا اور پھر طہارت سے متعلق جتنی احادیث تھیں ان سب کو اس باب میں یکجا کر دیا۔ اس کے برخلاف بعض علمائے احادیث کی تدوین رواۃ کے ناموں سے کی۔ مثلاً ابوہریرۃ سے جتنی روایتیں منقول ہیں وہ طہارت سے متعلق ہوں یا صوم سے سب کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ پہلی قسم کی کتب حدیث کو علماء فن کی اصطلاح میں کتاب السنن اور دوسری قسم کی کتب کو مسند کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض علماء تھے جنہوں نے احادیث کو سنن اور مسانید دونوں کے طریقوں پر جمع کیا ان علماء میں ابو بکر بن ابی شیبہ کا نام زیادہ مشہور ہے[2]

کتب حدیث میں فرق مراتب

پچاس سال کی مدت میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب مرتبہ کے لحاظ سے برابر نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ بعض جامعین حدیث کو ایسے مواقع میسر تھے کہ وہ صحت کے متعلق خوب جانچ پڑتال کر سکتے تھے۔ اور پھر ان کا جو سلسلۂ اسناد تھا وہ سب سے زیادہ قوی اور معتبر تھا ان کے برخلاف دوسرے علماء وہ تھے جنہوں نے کچھ زیادہ تنقید سے کام نہیں لیا اور صحیح و سقیم میں فرق کئے بغیر احادیث قلمبند کر دیں۔ حافظ ابن حجر امام بخاری کے عہد سے پہلے کی کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۴ [2] مقدمہ فتح الباری ص ۴۔

(امام بخاری نے جب ان سب تصانیف کو دیکھا۔ ان سے سیراب ہوئے اور ان کی خوشبو سونگھی تو انہوں نے دیکھا کہ وضع کے ماتحت ان میں صحیح احادیث بھی ہیں اور سقیم بھی، بلکہ اکثر مجموعے ایسے تھے جن میں ضعیف حدیثیں موجود تھیں۔ یہ دیکھ کر انہوں نے عزم کر لیا کہ وہ صحیح احادیث کو غیر صحیح احادیث سے الگ کر کے ایک مجموعہ میں شامل کر دیں گے[1])

تنقید احادیث (تیسری صدی ہجری کا زمانہ تدوینِ حدیث کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس زمانہ میں حدیث کی سب سے زیادہ اہم کتابیں تالیف ہوئیں۔ تنقیدِ رواۃ کے اصول متعین ہوئے۔ جرح و تعدیل کے اسباب مقرر کئے گئے۔ اور اب تک جس طرح متنِ حدیث کے یاد کرنے پرکھنے اور اس کو سمجھنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اسانید کو محفوظ رکھنے۔ اور ان کی صحت و سقم کی تحقیق و تفتیش کا بھی اہتمام ہونے لگا اور علم اسماء الرجال کے نام سے ایک مستقل علم کی بنیاد پڑی (اس عہد میں امام بخاری المتوفی ۲۵۶ھ نے الجامع الصحیح۔ امام مسلم المتوفی ۲۶۱ھ نے اپنی صحیح مرتب کی۔ اور ابن ماجہ المتوفی ۲۷۳ھ اور ابوداؤد المتوفی ۲۷۵ھ نے اپنی اپنی سنن۔ امام ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ نے اپنی جامع اور امام نسائی المتوفی ۳۰۳ھ نے اپنی سنن تصنیف کیں یہ چھ کتابیں حدیث کی سب سے زیادہ مستند اور صحیح کتابیں سمجھی جاتی ہیں اور ان کو "صحاح ستہ" کہتے ہیں۔)

فنِ تنقیدِ حدیث و اسناد کیوں ایجاد کیا گیا۔ اس کی بنیاد روایت و درایت کے کن اصول پر ہے؟۔ اور اس فن نے صحت و اعتبار حدیث کا پایہ کتنا بلند کر دیا؟۔ ان سب باتوں کو معلوم کرنے کے لئے پہلے "وضع حدیث" کی مختصر روئداد سن لینی چاہیئے۔ تاکہ محدثین کرام کی کوششوں کی پوری قدر ہو سکے۔

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۴

وضع حدیث کا فتنہ اور اس کا انسداد

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام و تابعین عظام کے عہد میں احادیث کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی جو کچھ حدیثیں تھیں زبانوں پر تھیں اور اسی طرح ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اس تقریب سے منافقوں اور دشمنان اسلام کو احادیث وضع کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں میں اختلاط و ارتباط پیدا کر کے احادیث موضوعہ کی نشر و اشاعت شروع کی اور اس طرح اسلام کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ابن عدی کہتے ہیں، عبدالکریم بن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے لیجایا گیا تو اس نے کہا، میں نے چار ہزار احادیث جن میں حرمت و حلت کے احکام ہیں۔ وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دی ہیں[1]۔

وضاعین حدیث کے مختلف طبقے

علامہ سیوطی نے ابن جوزی سے نقل کیا ہے کہ جن لوگوں کی احادیث میں جھوٹ۔ وضع اور قلب پایا جاتا ہے ان کی چند قسمیں ہیں بعض وہ لوگ ہیں جن پر زہد غالب تھا وہ احادیث کی حفاظت نہیں کر سکے یا ان کی کتابیں ضائع ہو گئیں یحییٰ بن معین سے روایت ہے "کہ میں نے جھوٹ اس جماعت سے زیادہ کسی میں نہیں پایا جو اپنے تئیں خیر اور زہد کی طرف منسوب کرتی ہے"۔ نہ بعض وہ لوگ تھے جو اگرچہ ثقہ تھے لیکن ان کی عقلوں میں فتور آ گیا تھا۔ اور وہ پھر بھی روایت حدیث سے باز نہیں آتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنہوں نے کوئی غلط روایت نقل کر دی۔ بعد میں انہیں اپنی غلطی کا علم بھی ہو گیا۔ لیکن از راہ سخن پروری

---

[1] تذکرۃ الموضوعات ص ،

انہوں نے رجوع نہیں کیا۔ ان مختلف لوگوں کے علاوہ ایک زندیقوں کا طبقہ تھا جو قصداً شریعت کو برباد کرنے اور اسلام میں فتنہ و شر کا دروازہ کھولنے کی غرض سے احادیث وضع کرتا تھا۔ ان زنادقہ میں کچھ لوگ ایسے جری بھی تھے جو موقع پاکر اپنے شیخ کی کتاب اٹھا لیتے اور اس میں من گھڑت حدیثیں بھی شامل کر دیتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو کسی خاص عقیدہ و خیال کے پابند تھے۔ اور اس کو لوگوں میں مقبول بنانے کے لئے احادیث وضع کرتے تھے۔ ابن لھیعہ فرماتے ہیں مجھ سے ایک خارجی العقیدہ شیخ نے کہا جس نے آخر میں توبہ کرلی تھی کہ ہم جب کسی امر کا ارادہ کرتے تھے تو فوراً اس کے لئے ایک حدیث وضع کر لیتے تھے۔ حماد بن سلمۃ فرماتے ہیں میں نے ایک رافضی سے سنا وہ کہتا تھا کہ جب ہم کسی چیز کو اچھا سمجھتے تھے تو اس کے لئے ایک حدیث وضع کر لیتے تھے۔ محمد بن القاسم الطالکانی فرقہ مرجیہ کا سردار تھا۔ اپنے عقیدہ کے مطابق کثرت سے احادیث وضع کرتا تھا۔ ان کے سوا کچھ وہ لوگ تھے۔ جو ترغیب و ترہیب کے لئے وضع حدیث کو جائز سمجھتے تھے اور وہ ایسا کرتے بھی تھے[1]

اسباب وضع حدیث وضع حدیث کے اسباب مختلف تھے۔ اجمالاً انہیں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ــــ سیاسی جھگڑے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلاف کی وجہ سے خوارج اور شیعہ کے جو دو فرقے پیدا ہو گئے تھے ان کو اپنے اپنے عقیدہ میں اتنا غلو تھا۔ کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کی شان میں بے تکلف احادیث وضع کرتے۔ اور من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار کی وعید کی ذرا پرواہ نہیں کرتے تھے۔ پھر بنو امیہ اور بنو عباس میں جو مستقل سیاسی رقابت قائم ہو گئی تھی۔ اس نے اس چنگاری کو ہوا دیکر دہکتی ہوئی آگ بنا دیا۔ اسی قبیل میں وہ احادیث شامل ہیں جو عربی عصبیت اور عجمی خودداری کی کشمکش کے باعث اختراع کی گئیں۔

---

[1] اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ ج ۲ ص ۴۰۶ - ۴۰۹

(۲)۔۔۔ دوسری صدی کے وسط میں کلامی اور فقہی مسائل کا زور ہوا تو اپنی وجاہت علمی کو نمایاں کرنے کے لیئے بعض لوگوں نے قصداً احادیث وضع کیں۔ اور چونکہ مسلمان ہر مسئلہ کا ثبوت قرآن و حدیث سے چاہتے تھے۔ اس لئے بعض وضاعین نے اپنے نظریہ کی تائید کے لئے جان بوجھکر حدیثیں وضع کیں اور ان کا عام چرچا کیا۔

(۳)۔۔۔ شخصی حکومت کے استبداد کی وجہ سے بعض لوگ ایسی محکومانہ ذہنیت رکھتے تھے کہ بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے سرکار دو عالم پر تہمت طرازی سے بھی باز نہیں آتے تھے۔

غیاث بن ابراھیم کے متعلق مشہور روایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ مہدی بن منصور کے پاس آیا۔ مہدی کو کبوتر بازی کا بہت شوق تھا۔ غیاث نے یہ دیکھتے ہی اس کو خوش کرنے کیلئے حدیث وضع کردی لاسبق الا فی خف او حافر او جناح۔ مہدی نے اس وقت تو خوش ہوکر غیاث کو دس ہزار درہم دلادیئے۔ لیکن جب وہ جانے لگا تو مہدی نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری گدی اُس شخص کی سی ہے جو رسول اللہ کی طرف غلط احادیث منسوب کرتا ہو۔ رسول اللہ نے او جناح نہیں فرمایا ہے تو نے ہم سے تقرب حاصل کرنے کے لئے اس لفظ کا اضافہ کردیا ہے[۱]

غرض یہ ہے کہ یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے دشمنان اسلام نے احادیث موضوعہ کا انبار لگادیا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان وضاعین کی نامراد کوششوں کی وجہ سے حدیث کا تمام ذخیرہ ناقابل اعتبار و استناد قرار دیا جاسکتا ہے۔؟ کیا ان فتنہ پردازوں کی سرکوبی کے لئے ائمہ دین اور علماء اسلام نے جو عدیم النظیر کوششیں کی ہیں وہ سب بے کار و بے فائدہ رہیں؟۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ابن دجاجۂ آیت کا جادو چل گیا اور اب ہم اس قابل نہیں ہیں کہ کسی ارشاد نبوی پر بھروسہ

---

[۱] شرح مسلم الثبوت جز ۲ ص ۱۵۲ و نخبۃ الفکر

کرسکیں؟ کیا یہ درست ہے کہ وضع و کذب کے دریا میں حقانیت و صداقت کے چند قطرے ایسے رَل مِل گئے ہیں کہ اب ان کا کہیں سراغ نہیں لگ سکتا؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید نے جس ذات گرامی کو خود اسوۂ حسنہ کہا تھا۔ ان افترا پرداز انسانوں کی ملعون حرکات کے باعث اس کے اقوال و افعال اب ایسے تاریک پردوں میں مستور ہوگئے ہیں کہ ہم ان سے کوئی روشنی حاصل کرکے اپنے ظلمتکدہ حیات کو روشن نہیں کر سکتے یہ جو قرآن نے ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کا اعلان کرکے ہم کو اسوۂ نبوی کی پیروی کی دعوت دی تھی۔ یہ سراسر بے کار ہی رہی؟

عہد صحابہ میں عدم کتابت حدیث کی وجوہ

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہم کو ان روایات و آثار پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام احادیث کے ساتھ کتنا اعتنا کرتے تھے۔ اور ان کو کس طرح حرز جان بنا کر رکھتے تھے۔ اس قسم کی روایات پہلے گذر چکی ہیں یہاں ان کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں البتہ اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ کو احادیث کا اتنا اہتمام تھا تو انہوں نے احادیث کی کتابت کیوں نہیں کی؟ اور کسی نے ایسا کرنا چاہا تو اسے اس کی اجازت کیوں نہیں دی؟ جواب یہ ہے کہ فرط احتیاط کے باعث صحابہؓ سمجھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان کو لکھیں اور کوئی شخص ان میں کمی بیشی کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کا غلط انتساب کردے تو اس کی ذمہ داری لکھنے والے پر عائد ہوگی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ائمۂ صحابہؓ چاہتے تھے کہ قرآن و حدیث میں مرتبہ کے اعتبار سے فرق باقی رہے۔ کتب میں مدوّن ہوجانے کے باعث ایسا نہ ہو کہ لوگ قرآن کو بھول جائیں۔ اور اپنی تمام توجہ حدیث پر مبذول کردیں۔ روایات و آثار سے ان دونوں باتوں کی تائید ثابت ہوتی ہے۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ "ہر وہ شخص جس نے کچھ احادیث لکھ رکھی ہوں میں اس کو قسم دیتا

ہوں کہ ان سب سے رجوع کرلے اور انہیں مٹا دے" پھر فرمایا۔

فانما ھلک الناس حیث یتبعوا	لوگوں نے جب کبھی اپنے علماء کی باتوں
احادیث علماءھم وترکوا کتاب	کا اتباع کیا اور اپنے رب کی کتاب چھوڑ
ربھم	دی ہلاک ہو گئے۔

(اس روایت میں "احادیث علمائھم" کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں)

• حضرت ابوسعید خدری سے کسی نے کہا کہ آپ جو احادیث نقل کرتے ہیں کیا ہم ان کی کتابت نہ کریں؟" فرمایا "ہم تم کو کتابت نہیں کرائیں گے۔ تم ہم سے روایات اسی طرح بیان کرو جس طرح ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں"

قرن اول میں کتابت حدیث سے اجتناب حدیث سے بے اعتنائی پر نہیں۔ بلکہ روایت حدیث میں کمال احتیاط پر مبنی تھا۔ امام زہری جلیل القدر محدث تھے۔ اور ان کا مشغلہ بھی درس و تدریس حدیث تھا لیکن کوئی مرتب مجموعۂ احادیث ان کے پاس بھی نہیں تھا۔ امام مالک فرماتے ہیں "لم یکن مع ابن شھاب کتاب الا کتاب فیہ نسب قومہ" علامہ قرطبی نے امام مالک کا ایک اور قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں

لم یکن القوم یکتبون انما کانوا	لوگ پہلے لکھتے نہیں تھے۔ صرف یاد
یحفظون۔ فمن کتب منھم الشیٔ	رکھتے تھے۔ ان میں سے اگر کوئی کوئی کچھ
فانما کان یکتبہ لیحفظہ فاذا حفظہ	لکھتا بھی تھا تو صرف یاد کرنے کے لئے لکھتا
محاہ	تھا۔ یاد ہو جانے کے بعد اسے مٹا ڈالتا تھا

اس مقام پر ایک اور روایت کا نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے عدم کتابت

لہ یہ سب روایتیں میں نے جامع بیان العلم و فضلہ ج ۱ ص ۶۴ سے لی ہیں۔

حدیث کے وجوہ و اسباب پر کامل روشنی پڑتی ہے۔ عبد الرحمن بن الاسود اپنے والد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "ایک مرتبہ مجھے اور حضرت علقمہ کو کہیں سے ایک صحیفہ مل گیا ہم دونوں اسے لیکر غروب آفتاب کے وقت حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے پاس گئے۔ اور دروازہ پر بیٹھ گئے۔ حضرت ابن مسعود نے جاریہ سے فرمایا۔ دیکھنا دروازہ پر کون ہے؟ جاریہ بولی علقمہ اور اسود۔ حضرت ابن مسعود نے ہم کو اجازت دیدی گھر میں داخل ہوکر ہم نے وہ صحیفہ دکھایا اور کہا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ حضرت عبد اللہ نے جاریہ کو طشت میں بھر کر پانی لانے کا حکم دیا۔ جاریہ نے حکم کی تعمیل کی۔ آپ نے فوراً پانی سے بدست خود اس صحیفہ کو مٹانا شروع کر دیا اور نحن نقص علیک احسن القصص پڑھنے لگے۔ ہم نے کہا ذرا اس کو تو دیکھ لیجئے۔ اس میں ایک عجیب حدیث ہے۔ لیکن حضرت عبد اللہ ابن مسعود پھر بھی نہ مانے اور اس صحیفہ کو مٹاتے ہی رہے اور فرمایا۔

ان هذه القلوب اوعية	یہ دل برتن ہیں۔ ان کو تم قرآنجید
فاشغلوها بالقرآن ولا تشغلوها	سے پُر کرو۔ اور اس کو دوسری چیز سے
بغيره	مت بھرو۔

ابو عبیدا جو اس قصہ کے ایک راوی ہیں اور سند میں مذکور بھی ہیں کہتے ہیں "معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیفہ اہلِ کتاب سے لیا گیا تھا۔ اس لئے حضرت ابن مسعود نے اس کو دیکھنا بھی مکروہ سمجھا"[1]

غرض یہ ہے کہ یہ وجوہ تھے جن کی بناء پر عہد صحابہ میں ایک طرف کتابت و تدوین حدیث نہیں ہوئی۔ اور دوسری طرف انہوں نے احادیث کے قبول کرنے۔ اور ان کی جانچ پڑتال

---

[1] جامع بیان العلم و فضلہ ج ۱ ص ۶۶

کرنے میں کافی اہتمام کرنا شروع کر دیا تاکہ احادیث صحیحہ غیر صحیحہ سے متمایز ہو جائیں۔

قبول حدیث میں صحابہ کی احتیاط

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں "جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ نہیں باندھا جاتا تھا۔ ہم احادیث قبول کرتے تھے۔ لیکن جب لوگ اس طرح کی باتیں کرنے لگے تو ہم نے آپ سے روایت کرنا ترک کر دیا" ایک اور حدیث اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔ بشیر العدوی کہتے ہیں "میں ایک مرتبہ حضرت ابن عباس کے پاس آیا اور اُنکے سامنے روایت بیان کرنے لگا۔ لیکن حضرت ابن عباس نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی میں نے کہا۔ ابن عباس! میں دیکھتا ہوں کہ آپ میری حدیث نہیں سنتے۔ فرمایا ایک زمانہ تھا کہ جب کوئی شخص ہمارے سامنے قال رسول اللہ کہتا تو ہماری نگاہیں فوراً اس کی طرف اٹھ جاتیں اور ہم بڑی توجہ سے وہ روایت سنتے تھے۔ لیکن اب جبکہ لوگوں نے خلط ملط کر دیا ہے ہم ان سے صرف وہی روایتیں قبول کرتے ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں[1]"

اس احتیاط کی وجہ سے اگر کوئی صحابی ان میں سے کسی کے پاس کوئی کتاب لاتا تو وہ اس میں جتنے حصہ کو صحیح سمجھتے رہنے دیتے اور باقی کو قلمزد کر دیتے۔ سفیان بن عیینہ سے روایت ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت ابن عباس کے پاس کوئی شخص ایک کتاب لایا اس میں حضرت علی کا کوئی فیصلہ تھا۔ حضرت ابن عباس نے تھوڑے سے حصہ کو رہنے دیا اور باقی کو مٹا دیا[2]"

بے تحقیق روایت پر وعید

کسی روایت کو سننے کے بعد اس کو اگر بیان کرنا چاہتے تو پہلے اس کی خوب چھان بین کر لیتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی

کفیٰ بالمرء کذبا ان یحدث	ایک آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی
بکل ما سمع[3]	کافی ہے کہ وہ ہر اس چیز کو بیان کر دے جو سنے

---

[1] صحیح مسلم باب النہی عن الروایۃ عن الضعفا [2] صحیح مسلم باب الروایۃ عن الضعفاء [3] ایضاً

ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی:

سیکون فی اٰخر اُمتی یحدثونکم	آخر امت میں ایسے لوگ آئیں گے جو تم سے
مالم تسمعوا انتم ولا اٰباءکم	حدیثیں بیان کریں گے۔ جن کو نہ تم نے
فایاکم وایاھم (صحیح مسلم باب الروایۃ عن الضعفاء)	سنا ہوگا اور نہ تمہارے آبا نے تم انسے بچتے رہنا

حضرت عبداللہ فرماتے تھے۔

ان الشیطان لیتمثل فی صورۃ	شیطان مرد کی صورت میں متمثل ہو کر ایک
الرجل فیأتی القوم فیحدثھم	جماعت کے پاس آئیگا اور ان سے جھوٹ
بالحدیث من الکذب فیتفرقون	حدیث بیان کرے گا جس کی وجہ سے وہ
فیقول الرجل منھم سمعت رجلا	لوگ متفرق ہو جائیں گے اور انمیں کا ایک شخص
اعرف وجھہ ولا ادری ما اسمہ	کہے گا کہ میں نے یہ حدیث ایسے شخص سے سنی ہے
یحدث[1]	جسکا چہرہ میں پہچانتا ہوں لیکن اسکا نام نہیں جانتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ صحت حدیث کی تحقیق میں بہت اہتمام کرتے تھے۔ جب تک انہیں راوی سے پورا تعارف نہ ہوتا وہ کسی حدیث کو یوں ہی قبول نہ کرتے تھے۔

کثرت روایت سے اجتناب

جو لوگ کثرت سے روایت کرتے تھے صحابہ کرامؓ انہیں اچھا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ایسے حضرات سے کسی روایت کے باب میں غیر محتاط رہنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

طاہر جزائری لکھتے ہیں

اذ الاکثار مظنۃ للخطا والخطاء	کیونکہ کثرت روایت سے خطا کا احتمال ہوتا ہے

[1] صحیح مسلم شریف باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء

فی الحدیث عظیم الخطر[1] — اور حدیث میں خطا بڑے خطرہ کا سبب ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کثیر الروایۃ صحابی تھے حضرت عمرؓ نے ان پر سختی کی کہ وہ کثرت سے روایت نہ کیا کریں تو حضرت ابوہریرہ نے بہ طور معذرت فرمایا۔

ان الناس یقولون اکثر ابوھریرۃ	لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ کثرت سے روایت کرتا ہے
ولولا اٰیتان فی کتاب اللہ ما حدثت	اگر قرآن مجید میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو
حدیثا ثم یتلوا ان الذین یکتمون	میں کوئی حدیث روایت نہ کرتا۔ اس کے بعد
ما انزلنا من البینات الی قولہ الرحیم	آپ آیت ان الذین یکتمون الایہ پڑھتے
ان اخواننا من المھاجرین کان	پھر فرماتے ہمارے بھائی مہاجرین بازار
یشغلھم الصفق بالاسواق	کے لین دین میں لگے رہتے تھے اور ہمارے
وان اخواننا من الانصار کان	بھائی انصار اپنے مالی معاملات میں۔
یشغلھم العمل فی اموالھم وان	مصروف رہتے تھے ان کے برخلاف ابوہریرہؓ
ابا ھریرۃ کان یلزم رسول اللہ	پر شکم ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم بشبع بطنہ	علیہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا۔ اور جبکہ
ویحضر ما لا یحضرون ویحفظ	انصار و مہاجرین نہ ہوتے تھے۔ ابوہریرہ
ما لا یحفظون[2]	ہوتا تھا اور جسے وہ یاد نہیں کرتے تھے ابوہریرہؓ
	یاد کرتا تھا۔

اس احتیاط کی وجہ سے جلیل القدر صحابہ کی ایک جماعت تھی جو بہت کم روایت کرتی تھی ان میں حضرت ابوبکرؓ۔ زبیرؓ۔ ابوعبیدہؓ۔ عباس بن عبدالمطلب رضوان اللہ علیہم اجمعین زیادہ

---

[1] توجیہ النظر الفصل الثالث۔ [2] صحیح بخاری باب حفظ العلم

مشہور ہیں۔ اور بعض بعض صحابیؓ تو وہ تھے جو روایت ہی نہیں کرتے تھے۔ مثلاً سعید بن زید بن عمرو بن نفیل۔ حضرت عمرؓ خود بھی روایت کم کرتے تھے اور دوسروں کو بھی قلت روایت کی تاکید کرتے تھے۔ مسلمانوں کا ایک لشکر عراق کی طرف روانہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے انہیں خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

جوّدوا القرآن واقلّوا الروایة	قرآن خوب اچھی طرح پڑھو اور رسول اللہ
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کم کرو۔[1]

عہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کر کے فرمایا "تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں بیان کرتے ہو جن میں تم خود مختلف ہوتے ہو تمھارے بعد جو لوگ آئیں گے وہ اس سے بھی زیادہ اختلاف کریں گے پس رسول اللہ کی حدیث بیان مت کیا کرو۔ اور تم سے کوئی بات دریافت کی جائے تو کہو۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے اس کے ہی حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو"[2]

حدیث پر شہادت | پھر ان کے سامنے کوئی معروف ثقہ شخص بھی حدیث بیان کرتا تو اسے بغیر شہادت کے قبول نہیں کرتے تھے۔ شہادت کے بعد اس حدیث کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت قطعی ہو جاتا تو اس پر سختی کے ساتھ عامل ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کیا کہ فلاں شخص جس کا انتقال ہو گیا ہے میرا نواسہ تھا اور میں اس کی نانی ہوں۔ متوفی کی میراث سے مجھ کو حصہ دلا دیجئے۔ آپ نے فرمایا "تیرے متعلق نہ تو کتاب اللہ میں کچھ ہے اور نہ سنت میں ہونے کا مجھکو علم ہے۔ لوگوں سے دریافت کروں گا پھر بتاؤں گا۔ آپ نے پوچھا تو حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے فرمایا "آنحضرت صلی اللہ

عہ بلکہ بعض اوقات تو غلط احادیث کی اشاعت کے خوف سے روایت حدیث کی ہی مخالفت کر دیتے تھے

[1] جامع بیان العلم وفضلہ للقرطبی [2] تذکرۃ الحفاظ ج ١ ص ٣

علیہ وسلم نے میرے سامنے نانی کو چھٹا حصہ دلایا ہے" حضرت ابوبکر بولے "تمہارا کوئی شاہد بھی ہے؟ محمد بن مسلمہ نے شہادت دی کہ "ہاں میرے سامنے رسول اللہ نے نانی کو چھٹا حصہ دلایا ہے"۔ خلیفہ اوّل نے یہ سنکر اس عورت کو بھی سُدس[1] دلا دیا۔

صحیح بخاری و مسلم میں۔ ابوسعید الخدری سے روایت ہے ہم ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابوموسیٰ گھبرائے ہوئے آئے۔ لوگوں نے اس گھبراہٹ کا سبب پوچھا۔ بولے "میں حضرت عمرؓ کی دعوت پر ان کے مکان پر حاضر ہوا تھا۔ دروازہ پر تین مرتبہ دستک دی۔ جواب نہیں ملا تو واپس چلا آیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک ملاقات میں حضرت عمر نے پوچھا "تم فلاں دن آئے نہیں؟ میں نے پورا قصہ نقل کر دیا اور ساتھ ہی کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "تم میں سے کوئی شخص کسی کے مکان پر جاکر تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اس کو جواب نہ ملے تو اسے واپس آجانا چاہیئے"۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر بولے "اس حدیث پر اپنا کوئی گواہ لیکر آؤ ورنہ اچھا نہیں ہوگا"۔ اہل مجلس نے کہا ہم میں سب سے چھوٹا اس کی شہادت دے گا۔ چنانچہ میں (ابوسعید الخدری) اٹھا اور حضرت عمرؓ کے روبرو حاضر ہو کر شہادت پیش کی۔ خلیفہ ثانی بولے۔ "ابوموسیٰ! میں تم کو متہم نہیں کرتا (نا قابل اعتبار نہیں سمجھتا) لیکن یہ معاملہ حدیث کا تھا۔ اس لئے گواہ کی ضرورت تھی"[2]

مسور بن مخرمہ کا بیان ہے "ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک ساقط بچہ کے بارہ میں مشورہ کیا۔ مغیرہ بولے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لونڈی سے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا "اگر تم سچے ہو تو اس پر شہادت پیش کرو"۔ محمد بن مسلم بولے میں شہادت دیتا ہوں کہ بیشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فیصلہ کیا تھا[3]

---

[1] مستدرک حاکم و ابوداؤد باب میراث الجدۃ [2] صحیح بخاری باب التسلیم والاستیذان ثلاثاً [3] ابوداؤد باب دیۃ الجنین

ایک واقعہ اس سے بھی زیادہ صریح ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ مسجد کی توسیع کیلئے حضرت عباسؓ سے زمین طلب کی۔ انہوں نے انکار کر دیا اور حدیث بیان کی کہ آپ زیادتی نہیں کر سکتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، اس پر گواہ پیش کیجئے ورنہ اچھا نہیں ہوگا" حضرت عباسؓ نے ایک جماعت انصار سے اس کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ کے سامنے ان لوگوں نے تصدیق کی کہ ہاں یہ حدیث صحیح ہے۔ خلیفہ دوم نے یہ سن کر فرمایا۔

انی لم اتھمک ولکنی احببت	میں آپ کو ناقابل اعتبار نہیں جانتا
ان اتثبت[1]	لیکن چاہتا تھا کہ تصدیق کر لوں

حضرت علیؓ کا بھی معمول تھا کہ ان کے سامنے کوئی شخص حدیث روایت کرتا تو آپ اس سے قسم لیتے تھے[2]۔

قبول حدیث کے معاملہ میں یوں تو تمام صحابہؓ اور خصوصاً حضرت ابن عباسؓ۔ ابن عمرؓ عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ بھی محتاط تھے۔ لیکن اولیت کا سہرا خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کے سر ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی فرماتے ہیں۔

وکان اول من احتاط فی	حضرت ابوبکرؓ قبول اخبار میں سب سے
قبول الاخبار	پہلے احتیاط کرنے والے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے متعدد حدیثوں پر شہادت طلب کر کے تثبت فی النقل کی سنت جاری کر دی اور لوگوں کو یہ بتا دیا کہ ایک حدیث کو دو ثقہ راوی بیان کریں تو وہ قوی ہو جاتی ہے۔

امام ذہبی حضرت عمرؓ کے حالات میں فرماتے ہیں۔

وھو الذی سنّ للمحدثین	حضرت عمرؓ ہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے محدثین کیلئے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ذکر حضرت علیؓ

التثبت فی النقل — تثبت فی النقل کی سنت جاری کی۔

پھر حضرت ابو موسیٰ والا مندرجہ بالا واقعہ نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

احب عمران یتأکد عندہ خبر ابی موسیٰ بقول صاحب آخر ففی ھذا دلیل علی ان الخبر اذا رواہ ثقتان کان اقوی و ارجح مما انفرد بہ واحد وفی ذلک حض علی تکثیر طرق الحدیث لکی یرتقی عن درجۃ الظن الی درجۃ العلم اذ الواحد یجوز علیہ النسیان والوھم ولا یکاد یجوز ذالک علی ثقتین لم یخالفھما احد۔[1] . . . .

حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ ابو موسیٰ کی حدیث کسی دوسرے شخص کی شہادت سے مؤکد ہو جائے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی خبر کو دو ثقہ آدمی بیان کریں تو وہ حدیث منفرد کی بہ نسبت زیادہ قوی اور قابل ترجیح ہو جاتی ہے اور حضرت عمرؓ نے ایسا کرکے طرق حدیث کی کثرت پر بھی لوگوں کو برانگیختہ کیا ہے تاکہ وہ درجۂ ظن سے نکل کر درجۂ علم کی طرف آ جائے کیونکہ واحد کے متعلق تو یہ احتمال رہتا ہے کہ اس پر بھول اور وہم طاری ہو گیا ہو لیکن دو ثقہ جن کی کسی نے مخالفت نہ کی ہو انکی نسبت ایسا احتمال صحیح نہیں ہو سکتا۔

امام ذہبی کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی اس احتیاط پسندی اور تشدد نے محدثین کے لئے شمع ہدایت کا کام کیا یعنی ان کے طرز عمل سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کوئی حدیث کس وقت قبول کرنی چاہیئے اور اس کا معیار کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کے عہد میں جو حدیثیں رائج تھیں صحابہ کرام انکو بے تکلف قبول کر لیتے تھے۔ حضرت معاویہؓ فرماتے تھے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۶، ۷

علیکم من الحدیث بما کان	حضرت عمرؓ کے عہد میں جو احادیث
فی عہد عمر فانہ کان قد	رائج تھیں تم ان کو مضبوط پکڑ لو۔ کیونکہ
اخاف الناس فی الحدیث	انہوں نے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ	علیہ وسلم سے احادیث روایت کرنے سے
وسلم[1]	ڈرا دیا تھا۔

طلب حدیث کیلئے سفر صحابہ کرامؓ جس طرح بے تحقیق روایت و حدیث کے قبول کرنے سے اجتناب کرتے تھے ان کو اگر معلوم ہوتا کہ کسی دور دراز مقام پر کسی ثقہ کے پاس کوئی حدیث ہے تو اس کو حاصل کرنے کیلئے سفر کے دشوار گذار مرحلوں کو بھی طے کرتے تھے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ کو معلوم ہوا کہ شام میں (ایک مہینہ کی مسافت پر) عبد اللہ بن انیس کے پاس ایک حدیث ہے انہوں نے اس کو حاصل کرنے کے لئے ایک اونٹ خریدا۔ اور خدا کا نام لیکر روانہ ہو گئے۔ ایک مہینہ کی مسافت طے کرنے کے بعد منزل مقصود پر پہونچے۔ عبد اللہ بن انیس کے مکان پر دستک دی وہ باہر آئے تو انہوں نے گلے لگالیا آنے کی وجہ دریافت کی۔ بولے میں نے سنا تھا کہ آپ کے پاس سرکار رسالتمآب کی ایک حدیث ہے۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس حدیث کو سنے بغیر ہی مر جاؤں۔ پھر وہ حدیث حاصل کی[2]۔

حدیث بیان کرتے وقت دہشت اور خوف روایت حدیث میں صحابہ کرام کی غایت احتیاط و تقویٰ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض کا حال یہ تھا کہ صحیح طور پر قال رسول اللہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ ابو عمرو الشیبانی کہتے ہیں کہ میں حضرت ابن مسعود

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۷، [2] امام بخاری نے اس روایت کو تمام و کمال ادب المفرد میں اور امام احمد اور ابو یعلیٰ نے اپنے اپنے مسند میں نقل کیا ہے۔ اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں بھی باب فی طلب العلم کے ترجمہ میں اس کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے

کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ وہ خوف کے مارے قال رسول اللہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اور اگر کہتے بھی تھے تو ان پر لرزہ طاری ہوجاتا تھا۔ اور کہتے تھے رسول اللہ نے اس طرح فرمایا یا "ایسا ہی فرمایا" یا "تقریباً ایسا ہی فرمایا" یا۔ یا۔ یا[1]

ان آثار و روایات سے جن کا تاریخی اعتبار بہرحال مسلّم ہے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

(۱) صحابہ کرام روایت و قبول حدیث کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط پسند تھے۔

(۲) وضاعین و کذابین کا طبقہ ان کے عہد میمنت مہد میں ہی پیدا ہوا گیا تھا۔

(۳) ان لوگوں کے فتنہ و شر سے بچنے اور صحیح احادیث کو محفوظ رکھنے کے لئے صحابہ کرام نے قبول حدیث کے لئے ایک خاص معیار قائم کرلیا تھا کہ جو حدیث اس پر پوری اترتی تھی اس کو بے تکلف قبول کرتے۔ اور اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

(۴) صحابۂ کرام کی ان احتیاط پسندیوں کے باعث صحیح و غیر صحیح احادیث میں ایک خط امتیاز کھنچ گیا۔ اور وضاعین و کذابین کے تمام منصوبے پادر ہوا ثابت ہوئے۔

کثرت سے روایت کرنے والے صحابہ

یہ معلوم ہوچکا ہے کہ روایت حدیث میں تمام صحابہ برابر نہیں تھے بعض روایت کم کرتے تھے۔ اور بعض زیادہ جنہوں نے روایات کثرت سے نقل کی ہیں ان میں حسب ذیل بزرگان امت نمایاں شہرت رکھتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ۔ حضرت عائشہ رضؓ ام المومنین۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ عبداللہ بن عباسؓ جابرؓ انس بن مالکؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ کی مرویات کی تعداد ۵۳۷۴ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں کی تعداد ۲۲۱۰ ہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ تذکرۂ حضرت ابن مسعود العالم الربانی

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور انس بن مالکؓ کی روایتوں کی تعداد بھی قریب قریب حضرت عائشہؓ کے برابر ہے۔ حضرت جابرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیثیں ۱۵۰۰ سے متجاوز نہیں ہیں۔ حضرت عمرؓ روایت کے معاملہ میں بے انتہا احتیاط پسند تھے آپ کی روایات ۵۳۷ سے زیادہ نہیں ہیں۔

مستشرقین یورپ جو اسلام پر اعتراض کرنے کے لئے ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتے ہیں انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ پر ان کی کثرت روایت کی وجہ سے بہت لے دے کی ہے۔ اور بعض دریدہ دہنوں نے تو ان دونوں بزرگان کی شان میں گستاخانہ الفاظ بک دینے سے بھی احتراز نہیں کیا۔ تعجب یہ ہے کہ مصر اور ہندوستان کے بعض ارباب علم تک ان سے متاثر ہو گئے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے متعلق بھی ایک اجمالی گفتگو کر لی جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ

حضرت ابوہریرہؓ کا اصلی وطن یمن تھا۔ قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے تھے نام عمیر تھا۔ ابوہریرہؓ کنیت تھی۔ ہریرۃ عربی زبان میں چھوٹی بلی کو کہتے ہیں۔ اس کنیت کی وجہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ "میں اپنے گھر والوں کی بکریاں چراتا تھا۔ میرے پاس ایک بلی تھی۔ اسے میں رات کے وقت ایک درخت میں رکھدیتا تھا۔ اور دن کو اسے اپنے ساتھ چراگاہ لیجاتا جہاں میں اس سے کھیلتا رہتا تھا۔ اس بنا پر لوگ مجھے ابوہریرہ کہنے لگے"[1]

اسلام اور جستجوئے علم ۷ھ میں بمقام خیبر اپنے قبیلہ کی ایک جماعت کے ساتھ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر دولت اسلام سے بہرہ اندوز ہوئے۔ آپ کو علم کی بڑی جستجو تھی۔ ہر وقت اسی دھن میں مصروف رہتے تھے۔ اور اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنے میں بھی بڑے جری اور بے باک واقع ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے ابطور شکایت کہا کہ ابوھریرۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کثرت سے روایت کرتے ہیں" فرمایا "پناہ بخدا ان کی روایات میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ کرنا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سرکار رسالتمآب سے سوال کرنے میں بہت جری تھے۔ اور اسی لئے ایسے ایسے سوالات کرتے تھے جن کو ہم لوگ پوچھ بھی نہیں سکتے تھے"[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی اس جستجو علمی اور ذوق تحقیق و تلاش کا اعتراف تھا چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے سید کونینؐ سے دریافت کیا "قیامت کے دن کون

[1] ترمذی مناقب ابوہریرہ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰

خوش نصیب آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق ہوگا" ارشاد گرامی ہوا "تمھاری حرص علی الحدیث دیکھ کر مجھ کو پہلے سے خیال تھا کہ یہ سوال تم سے پہلے کوئی دوسرا نہیں کرے گا"[1]

حضرت ابوہریرہؓ کیلئے دعاء نبوی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوہریرہ کے ذوق علم کی اس درجہ قدر کرتے تھے کہ ان کے علم کی پختگی اور حافظہ کی قوت کیلئے دعائیں فرماتے تھے۔ زید بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں "ایک دن میں اور ابوہریرہؓ اور ایک اور شخص مسجد میں بیٹھے ذکر خدا و دعاء میں مشغول تھے۔ اتنے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ہم لوگ خاموش ہو گئے۔ آپ نے فرمایا "اپنا شغل جاری رکھو۔ یہ سن کر میں اور وہ دوسرا شخص دعائیں کرنے لگے جن پر آپ آمین کہتے جاتے تھے"۔ ہمارے بعد ابوہریرہؓ نے دعاء کی "خدایا جو کچھ میرے ساتھی مجھ سے قبل مانگ چکے ہیں وہ مجھے عطا فرما۔ اور اسکے علاوہ ایسا علم بھی عنایت کر جس کو میں کبھی فراموش نہ کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بھی آمین کہی۔ اب ہم دونوں نے عرض کیا "یارسول اللہ! ہم کو بھی ایسا علم عطا کیا جائے جو فراموش نہ ہو۔ ارشاد حق بنیاد ہوا" وہ دوسی نوجوان (ابوہریرہؓ) کے حصہ میں آچکا"۔ ایک مرتبہ انہوں نے بارگاہ رسالت میں ضعف حافظہ کی شکایت کی آپ نے فرمایا "چادر پھیلاؤ"۔ انہوں نے چادر پھیلا دی۔ آپ نے اس میں دونوں دست مبارک ڈالے پھر فرمایا "اسے سینہ سے لگالو"۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں "اس کے بعد میں پھر کبھی نہیں بھولا"[2]

جلالت علم

حضرت ابوہریرہؓ کے ذوق وشوق، محنت وجستجو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شفقت و دعاء کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علم حدیث کے سب سے بڑے حافظ بن گئے۔ اس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحیح البخاری باب الحرص علی الحدیث [2] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۶۶ [3] صحیح بخاری باب حفظ العلم

نے خود ان کو "علم کا ظرف" فرمایا[۱]۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو خود بھی صحابہ میں بڑے پایہ کے محدث ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ ہم سب میں اعلم بالحدیث[۲] تھے۔ حافظ ذہبی جو تنقید رواۃ میں مرتبۂ بلند رکھتے ہیں فرماتے ہیں۔ ابو ہریرہؓ علم کا ظرف تھے اور صاحب فتوی ائمہ کی جماعت میں اونچا مقام رکھتے تھے[۳]۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔ "ابو ہریرہ اپنے ہمعصر راویوں میں سب بڑے حافظ تھے اور تمام صحابہ میں کسی نے حدیث کا اتنا ذخیرہ فراہم نہیں کیا[۴]۔" امام شافعیؒ کی رائے تھی کہ ابو ہریرہؓ ہمعصر حفاظ حدیث میں سب بڑے حافظ حدیث تھے۔

روایات حضرت ابو ہریرہ نے جو روایتیں بیان کی ہیں ان کی مجموعی تعداد ۵۳۷۴ ہے۔ ان میں ۳۲۵ متفق علیہ ہیں ۷۹ میں امام بخاری اور ۹۳ میں امام مسلم منفرد ہیں[۵]۔

حضرت ابو ہریرہ کی کثرت روایت پر بعض لوگوں نے شک وشبہ کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ کیا محض اس بناء پر کہ وہ روایات کثرت سے بیان کرتے تھے ہم ان پر کسی قسم کا شک کر سکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں ہم کو چند باتیں نظر انداز نہ کرنی چاہئیں

(۱) کثرت روایت کا سبب کیا تھا؟

(۲) اجلۂ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے یا نہیں؟

(۳) ان کا حافظہ کیسا تھا؟

(۴) احادیث لکھتے تھے یا نہیں؟

(۵) نقل روایت میں ان کا عام انداز احتیاط پسندانہ تھا یا نہیں؟

(۶) جتنی کثیر روایتیں حضرت ابو ہریرہ سے منقول ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[۱] بخاری کتاب العلم [۲] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰ [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۸

[۴] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۲۶۶ [۵] تہذیب الکمال ص ۴۶۲

معیت وصحبت کی مدت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی تعداد عقلاً وعادۃً مستبعد ہے یا نہیں؟ اب ہم ان میں سے ہر ایک کے متعلق بالترتیب گفتگو کرتے ہیں۔

کثرت روایت کے اسباب حضرت ابوہریرہ کو اللہ تعالیٰ نے جس قدر ذوق علم شوق تحقیق وجستجو عطا فرمایا تھا۔ اسی قدر ان کو علم کی اشاعت وتوسیع کا بھی بڑا شوق تھا۔ اور ان کی دلی آرزو تھی کہ اقوال نبوی کا جو گنجینہ نایاب ان کے سینہ میں محفوظ ہے اس سے وہ دوسروں کو بھی فیضیاب کریں ان کو اس کا نہ صرف ذاتی شوق تھا۔ بلکہ قرآن مجید کی ایک آیت کے بحکم اشاعت علم کو وہ اپنا ایک مذہبی فریضہ جانتے تھے۔ لوگوں نے اسی زمانہ میں ان پر اعتراضات کئے تو انہوں نے خود فرمایا "اگر سورۂ بقرہ کی یہ آیت۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ	بے شبہ وہ لوگ جو ہماری نازل کی ہوئی کھلی ہوئی
وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ	نشانیوں کو اسکے بعد کہ ہم نے انکو کتاب میں لوگوں
فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ	کیلئے بیان کر دیا ہے چھپاتے ہیں ان پر اللہ لعنت
وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ	بھیجتا ہے۔ اور لعنت بھیجنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں

نہ ہوتی تو میں کبھی کوئی حدیث نہ بیان کرتا۔[1]

ایک طرف اشاعتِ علم کا یہ جذبہ اور دوسری طرف ان کو مواقع ایسے میسر تھے جو کسی دوسرے کو نہیں تھے۔ وہ خود ہی بیان کرتے ہیں "لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں میں اپنے کاروبار میں لگے رہتے تھے۔ اور انصار صاحب جائداد تھے وہ اس کے انتظامات میں مصروف رہتے تھے۔ میں فارغ البال تھا۔ ہر وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہتا تھا جن

---

[1] بخاری کتاب العلم

اوقات میں وہ لوگ موجود نہیں ہوتے تھے۔ میں ان میں بھی حاضر رہتا تھا۔ اور دوسرے لوگ جن چیزوں کو فراموش کر دیتے تھے میں انہیں یاد رکھتا تھا۔[1]

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے ان سے پوچھا "تم کیسی حدیثیں بیان کرتے ہو، حالانکہ جو کچھ میں نے دیکھا (یعنی افعال نبوی) اور سنا (قول نبوی) وہی تم نے بھی سنا اور دیکھا" بولے "اماں! آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تطییب خاطر کے لئے زیبائش و آرائش میں مصروف رہتی تھیں۔ اور مجھ کو خدا کی قسم کوئی چیز سرکار دو عالم سے غافل نہیں کر سکتی تھی۔[2]

اجلۂ صحابہ ان پر اعتماد کرتے تھے

حضرت ابوہریرہ کی اس خصوصیت کو دوسرے اجلۂ صحابہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ اور ان کے مخصوص حالات کے باعث ان کی روایتوں پر اعتماد کرتے تھے۔ ابوعامر روایت کرتے ہیں "ایک مرتبہ میں حضرت طلحہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا "ابومحمد! ہم کو نہیں معلوم یہ یمنی (ابوہریرہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ جانتا ہے یا تم" حضرت طلحہ نے فرمایا، اس میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ حدیثیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں۔ اور انہیں وہ چیز معلوم ہے جسے ہم نہیں جانتے۔ ہم لوگ مالدار تھے۔ ہمارے اپنے گھر تھے بال بچے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صبح شام آتے اور چلے جاتے تھے۔ ابوہریرہ مسکین تھے ان کے پاس نہ مال تھا اور نہ ان کے متعلقین تھے۔ ان کا ہاتھ سرور کونین کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں سرکار جاتے تھے وہ بھی جاتے تھے۔ پھر کہا فرمایا ہم میں شک نہیں کرتے کہ وہ ایسی چیزیں جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے۔ اور انہوں نے ایسی حدیثیں سنی ہیں جو ہم نے نہیں سنیں اور

ولم یتهمه احد منا انه تقول — ہم میں سے کسی نے ان کو اسکی تہمت نہیں لگائی

---

[1] صحیح مسلم فضائل ابی ہریرہ و بخاری کتاب العلم [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۰۹ و ۵۱۰ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۱ و ۵۱۲

علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مالم یقل ھذا حدیث صحیح الاسناد علی شرط الشیخین[1]

کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی قول ایسا منسوب کیا ہے جو آپ نے نہیں فرمایا۔

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ نے ایک حدیث بیان کی۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے وہاں سے گذرتے ہوئے اس کو سنا تو فرمایا۔ ابوھریرہ! دیکھو تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا روایت کر رہے ہو۔ حضرت ابوہریرہ فوراً اٹھ کھڑے ہو گئے اور سیدھے حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا آپ نے بھی یہ حدیث سنی ہے؟" فرمایا "ہاں! میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے۔ اس پر حضرت ابوہریرہ بولے "ہم کو رسول اللہ سے نہ تو ازدواجی تعلق غافل رکھ سکتا تھا اور نہ بازاروں میں لین دین کرنا۔ میں آنحضرت سے صرف دو چیزیں طلب کرتا تھا۔ کوئی کلمہ جس کی آپ مجھ کو تعلیم دیں یا ایک لقمہ جو آپ مجھ کو کھلائیں۔ ابن عمر بولے

کُنتَ اَلزَمَنَا لِرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واعلمنا بحدیثہ[2]

اے ابوہریرہ۔ آپ ہم سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے والے اور آپ کی احادیث کو جاننے والے تھے۔

ایک مرتبہ مروان کو حضرت ابوہریرہ کی کوئی بات ناگوار ہوئی، اس نے غضب ناک ہو کر کہا لوگ کہتے ہیں" ابوہریرہ بہت حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ آنحضرت کی وفات کے کچھ ہی دنوں پہلے مدینہ میں آئے تھے۔ فرمایا "میں جب مدینہ میں آیا تو حضرت خیبر میں تشریف رکھتے تھے۔ اس وقت میری عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی اور آپ کی وفات تک سایہ کی طرح آپ کے ساتھ رہا۔ آپ کے ساتھ ازواجِ مطہرات کے گھر دن میں جاتا تھا آپ کی خدمت کرتا تھا

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۱ و ۵۱۲ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰ و ۵۱۱

آپ کے ساتھ لڑائیوں میں شریک ہوتا تھا۔ آپ کے ہمراہ حج کرتا تھا۔ اس لئے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ حدیثیں جانتا ہوں، خدا کی قسم وہ جماعت جو مجھ سے قبل آپ کی صحبت میں تھی وہ بھی میری حاضر باشی کی معترف تھی اور مجھ سے حدیثیں پوچھتی تھی۔ ان میں حضرت عثمان رضؓ عمر رضؓ طلحہ رضؓ اور زبیر رضؓ خاص طور پر قابل ذکر ہیں[1]۔

حضرت ابوایوب انصاری رضؓ جنکے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہونچکر قیام فرمایا تھا بڑے پایہ کے صحابی تھے لیکن اس کے باوصف وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے تھے کسی نے انسے اسکی وجہ دریافت کی تو فرمایا میں ابوہریرہ سے کوئی حدیث روایت کروں مجھکو یہ زیادہ پسند ہے بہ نسبت اسکے کہ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کروں۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابوایوب کو اپنے حافظہ پر اتنا اعتماد نہیں تھا۔ جتنا حضرت ابوہریرہ کے حافظہ پر تھا وہ ڈرتے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں براہ راست کسی حدیث کو آنحضرتؐ سے نقل کروں اور اس میں کچھ کمی بیشی ہو جائے۔

قوت حافظہ حضرت ابوہریرہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملازمت و قرب مسلسل کا جو شرف حاصل تھا اس پر ان کی قوت حافظہ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حافظہ کی قوت کے لئے دعاء کی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا جیسا کہ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جو حدیث سن لیتے تھے بھولتے نہیں تھے۔ لوگ مختلف طریقوں سے امتحان لیتے تھے۔ اور بالآخر انہیں حضرت ابوہریرہ کی قوت حافظہ کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ ایک مرتبہ مروان نے حضرت ابوہریرہ کو بلایا اور اپنے کاتب کو تخت کے نیچے بٹھا کر ان سے حدیثیں پوچھنی شروع کیں ابوھریرہ بولتے جاتے تھے اور کاتب انہیں لکھتا جاتا تھا (حضرت ابوہریرہ کو اس کی خبر بالکل نہیں تھی) ایک سال کے بعد مروان

---

[1] اصابہ ج ۷، ص ۲۰۵ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۲

نے انہیں پھر طلب کیا۔ اور اس نے وہی حدیثیں دریافت کیں، حضرت ابوہریرہ نے گذشتہ سال کی طرح اس مرتبہ بھی بے کم و کاست۔ بغیر زیادتی اور کمی کے وہ سب حدیثیں نقل کردیں یہاں تک کہ ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں[1] آیا۔

حدیث کی کتابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک تو غالباً حضرت ابوہریرہ نے حدیث کی کتابت نہیں کی کیونکہ اول تو انہیں اس کی فرصت ہی نہیں ہوتی ہوگی اور پھر انہیں یہ امید تھی کہ جس کسی حدیث میں کچھ شک ہوگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرکے اس کو رفع کرلیں گے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی وفات کے بعد قوتِ حافظہ کے باوجود ازراہ احتیاط انہوں نے حدیثیں قلمبند کرنی شروع کردی تھیں اور پھر وہ جب تک اپنی کتاب نہ دیکھ لیتے کسی روایت کی توثیق و تصدیق نہ کرتے تھے۔ چنانچہ فضل بن حسن اپنے والد حسن بن عمرو کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوہریرہ کو ایک حدیث سنائی۔ انہوں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حسن بولے میں نے یہ حدیث آپ سے ہی سنی ہے۔ فرمایا اگر مجھ سے سنی ہے تو میرے پاس ضرور لکھی ہوگی۔ اس کے بعد ابوہریرہؓ حسن کو ساتھ لیکر گھر گئے اور ایک کتاب دکھائی۔ جس میں تمام حدیثیں درج تھیں۔ اس میں وہ حدیث بھی تھی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا، میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اگر تم نے وہ حدیث مجھ سے سنی ہے تو ضرور میری کتاب میں ہوگی۔

احتیاط اس روایت سے ان کی احتیاط فی الروایت کا بھی علم ہوتا ہے کہ کسی حدیث پر یونہی حکم نہیں لگادیتے تھے۔ بلکہ جب تک اس کی خوب تحقیق نہ کرلیتے نفیاً یا اثباتاً کچھ نہ فرماتے اس کے علاوہ ایک اور روایت ہے جس سے ان کی خشیتِ الٰہی اور حدیث رسول اللہ کے

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۰ [2] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۱۱

جذبۂ احترام کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مرتبہ شفیا اصبحی مدینہ آئے تو حضرت ابوہریرہ کو دیکھا کہ بیہوش پڑے ہوئے ہیں اور لوگ ان کے چاروں طرف جمع ہیں۔ یہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گئے جب ذرا ہوش آیا تو درخواست کی کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی ایسی حدیث سنائیے جس کو خود آپ نے سنا اور سمجھا ہو۔ ابوہریرۃ بولے "ہاں ایسی حدیث سناؤں گا۔ یہ کہا اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئے۔ تین مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ ہوش میں آتے اور یہ کہکر کہ ہاں ایسی ہی حدیث سناؤں گا۔ پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔ چوتھی بار بیہوشی کا حملہ اتنا شدید ہوا کہ غش کھا کے منہ کے بل گر پڑے۔ شفیا اصبحی نے ان کو سنبھال لیا اور دیر تک لئے بیٹھے رہے۔ افاقہ ہوا تو ایک حدیث بیان کی[1]۔

حق گوئی | خشیت ربانی کے غلبہ کا ہی نتیجہ تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نہایت بے باک اور جری واقع ہوئے تھے۔ حضرت ابوہریرہ مدینہ میں قیام پذیر تھے یہاں کا گورنر مروان تھا ایک مرتبہ ابوہریرہ اس کے گھر تشریف لیگئے۔ تو تصویریں آویزاں دیکھیں۔ چپ نہ رہسکے فرمایا "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا کی مخلوق کی طرح مخلوق بناتا ہے۔ اگر اس کی قدرت میں ہے تو کوئی ذرۂ غلہ یا جو پیدا کر کے دکھائے[2]۔

عام تبصرہ | اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت ابوہریرہ غزوہ خیبر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر مشرف باسلام ہوئے۔ اس لحاظ سے ان کو صرف چار سال صحبت نبوی سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ حضرت ابوہریرہ سے جو حدیثیں منقول ہیں ان کی تعداد اس مدت کے پیش نظر بظاہر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے

---

[1] ترمذی ابواب الزہد باب الریاء والسمعۃ [2] مسند امام احمد بن حنبل۔

کہ ان چار سالوں کی مدت میں حضرت ابوہریرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوئے۔ اور سفر و حضر میں جلوت و خلوت میں، رزم میں اور بزم میں ہر جگہ اور ہر مقام پر وہ آنحضرت کے ساتھ ساتھ رہے۔ اور اس شرفِ معیت کی وجہ سے وہ حضور پاک کے تمام اقوال و افعال دیکھتے اور سنتے تھے۔ پھر خود بھی سوال کرنے میں بڑے جری اور بے باک تھے۔ تو یہ باور کر لینا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ دراصل ان سب چیزوں کے لحاظ سے حضرت ابوہریرہ کی مرویات کی تعداد مدت معیت کے اعتبار سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بحث تو "مرویاتِ ابوہریرہ" کی کمیت کے لحاظ سے تھی۔ اب حضرت ابوہریرہ کی قوتِ حافظہ۔ احتیاط فی الروایت اجلۂ صحابہ کا ان پر اعتماد و وثوق، خشیت ربانی، خوف قیامت، فقر و استغنا، اعلانِ حق میں جرأت و بے باکی، احادیث رسول اللہ کے ساتھ غایت درجہ عشق و محبت ان کا نہایت احترام، احادیث کی کتابت ان سب چیزوں پر غور کیجئے تو مرویاتِ ابوہریرہ کی کیفیت کے متعلق بھی صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس پایہ کی ہیں۔ اور ہمارے لئے کس درجہ لائقِ اعتماد ہو سکتی ہیں۔

یہ بھی واضح رہے کہ جن محدثین نے حضرت ابوہریرہ کی بعض حدیثوں پر کلام کیا ہے وہ اس پر مبنی نہیں ہے کہ انہیں حضرت ابوہریرہ پر اعتماد نہیں بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ سے محدث تک جو سلسلۂ رواۃ ہے اس میں بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر ثقہ یا متکلم فیہ ہیں ورنہ محدثین کا اتفاق ہے کہ الصحابۃ کلہم عدول یعنی صحابی سب عادل ہیں۔

وفات حضرت ابوہریرہ نے ۵۸ھ میں مدینہ طیبہ میں وفات پائی

حضرت عبداللہ بن عباس

نام ونسب عبداللہ نام ابوالعباس کنیت، والد ماجد کا نام عباسؓ اور والدۂ ماجدہ کا اسم گرامی ام الفضل لبابہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے بھانجے تھے۔ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت عباسؓ ۸ھ میں فتح مکہ سے کچھ پہلے علانیہ حلقہ بگوش اسلام ہوکر مدینہ پہونچے تو حضرت عبداللہ بھی ساتھ تھے۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ عمر کے اعتبار سے اگرچہ بچہ تھے۔ لیکن حضرت عباسؓ کی تاکید کی وجہ سے خدمت نبوی میں اکثر حاضر رہتے تھے اور مجلس کے مذاکرات سنتے تھے۔

مستشرقین کو حضرت ابن عباسؓ پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف تیرہ یا چودہ برس کی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ عمر بچپن کی ہے۔ جبکہ انسان میں سنجیدگی معاملہ رسی اور حقیقت بینی کا فقدان ہوتا ہے اس لئے جو حدیثیں آپ سے مروی ہیں ان کا کیا اعتبار ہوسکتا ہے؟

اس اعتراض کا جواب معلوم کرنے کیلئے ہم کو امور ذیل پر غور کرنا چاہیئے۔

(۱) حضرت ابن عباس کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا تعلق تھا؟

(۲) آپ کا علمی پایہ کیا تھا؟

(۳) صحابہ میں آپ کو کیا وقعت ومنزلت حاصل تھی؟

(۴) روایات میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا؟

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ابن عباسؓ پر رسول اللہؐ کی نظر شفقت و تربیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابن عباس کے ساتھ اول تو قرابت و رشتہ داری کا تعلق تھا۔ پھر یوں بھی آپ ان کی ذہانت و فطانت، ہونہاری و سلامت روی کے باعث ان سے محبت کرتے تھے۔ ابن عباس آئندہ چل کر کیا ہونے والے تھے۔ ارباب نظر اس کا اندازہ اسی ایک بات سے کر سکتے ہیں کہ انکی پیدائش کے بعد حضرت عباسؓ انہیں خدمت نبوی میں لیکر حاضر ہوئے تو آپ نے اپنے لعابِ دہن سے اس بچہ کے کام و دہن کی ضیافت کرکے اس کی دستاویز ارجمندی و بخت بلندی پر مہر تصدیق ثبت کر دی[۱]۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سینہ سے لگا کر دعا کی اللّٰھم علمہ الحکمۃ۔ اے اللہ تو انہیں حکمت سکھا دے۔ بعض روایتوں میں حکمت کے بجائے فقہ کا لفظ آتا ہے[۲]

اوپر معلوم ہو چکا ہے ام المومنین حضرت میمونہ حضرت ابن عباس کی خالہ تھیں۔ وہ ان کو نہایت عزیز رکھتی تھیں۔ اس بنا پر آپ اکثر حضرت میمونہ کے گھر میں رہتے۔ اور کبھی کبھی رات کو بھی یہیں سو جاتے تھے۔ اس تقریب سے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتگذاری کا شرف حاصل ہو جاتا تھا۔

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب میں نماز کے لئے بیدار ہوئے۔ ابن عباسؓ نے وضو کے لئے پانی لاکر رکھدیا۔ آپ نے پوچھا، پانی کون لایا تھا؟ حضرت میمونہ بولیں عبد اللہ سرور کائنات نے خوش ہو کر دعائیں دیں اللّٰھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل۔ اے خدا انکو مذہب کی صحیح سمجھ عطا فرما۔ اور تاویل کا طریقہ سکھا[۳]۔

حضرت میمونہؓ کے ہی گھر کا دوسرا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ تہجد کی نماز

---

[۱] اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۹۳ [۲] ایضاً [۳] مسند امام احمد ج ۱ ص ۳۲۸

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہوئے۔ آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے برابر کھڑا کر لیا۔ لیکن وہ حیران و ششدر ہو کر رہ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہو کر دریافت کیا "کیا حال ہے"؟ بولے "یا رسول اللہ! کیا آپ کے برابر کھڑا ہونا کسی کے لئے مناسب ہے حالانکہ آپ رسول خدا ہیں" یہ سن کر سید دو عالم بہت خوش ہوئے۔ اور ان کے لئے علم و فہم کی زیادتی کی دعاء فرمائی[1]

وفات نبوی کے وقت ابن عباسؓ کی عمر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت ابن عباس کی عمر کیا تھی؟ اس میں اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر نے خود حضرت ابن عباس سے جو روایت بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر پندرہ سال کی تھی لیکن غالبًا یہ زیادہ صحیح ہے کہ اس وقت آپ تیرہ برس کے تھے۔ اب غور کیجئے تیرہ سال کی عمر کا ایک تندرست بچہ اور بالخصوص عرب ایسے گرم ملک کی آب و ہوا میں رہنے والا اچھا خاصہ جوان اور ذی شعور و احساس ہو جاتا ہے۔ اور ایک معمولی قسم کا دانا و بینا انسان بھی اس عمر کے بچہ کو اور اس کے عام اطوار و حرکات کو دیکھکر باطمینان تام اس کی آئندہ زندگی کے متعلق پیش گوئی کر سکتا ہے۔ پس اس عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابن عباس کے ساتھ غیر معمولی محبت و شفقت ظاہر کرنا۔ اور متعدد مواقع پر ان کے لئے دعائیں فرمانا۔ اور حضرت ابن عباسؓ کو دوسروں کی بہ نسبت آپ سے قرب و اتصال کے مواقع کا میسر ہونا۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابن عباس امت کے بہت بڑے ذمہ دار عالم اور شریعت و مذہب کے رموز و اسرار کے امین ہونے والے ہیں۔

علمی کمال

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے مطابق یہی ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۵۳۴

علم وحکمت کے ایک بحر ناپیدا کنار ہوگئے۔ قرآن۔ تفسیر۔ فقہ۔ حدیث۔ لغت اور شاعری ان میں کوئی علم ایسا نہیں تھا جس میں ان کو مہارت تامہ حاصل نہ ہو مستشرقین حضرت ابن عباسؓ کی کثرت روایت کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت انکی کم عمری کو دیکھکر انکی راویتوں پر شک وشبہ کا اظہار تو کرنے لگتے ہیں لیکن حضرت ابن عباسؓ نے جس قدسی ماحول میں تربیت پائی اور پھر خود انہوں نے جس ذوق وشوق اور محنت وکاوش سے علم وکمال کی تحصیل کی۔ اور اجلۂ صحابہ کے حیات ہونیکی وجہ سے جو ان کو اس کے بیش از بیش مواقع حاصل تھے۔ ان کو بالکل نظرانداز کر جاتے ہیں۔

ذیل میں چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں جن سے حضرت ابن عباسؓ کے شوق علم کا اندازہ ہوگا۔

حضرت ابن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک انصاری سے کہا کہ رسول اللہ وفات پا گئے۔ لیکن آپ کے اصحاب زندہ ہیں، چلو ان سے علم حاصل کریں انصاری بولے ابن عباس! لوگ خود علم میں تمھارے محتاج ہیں۔ پھر تم دوسروں کے پاس کیوں جاتے ہو۔ حضرت ابن عباس نے یہ سن کر انہیں چھوڑ دیا اور تنہا تحصیل علم کے لئے نکل پڑے۔ تحقیق وجستجو کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ جس کسی شخص کے پاس انہیں کوئی حدیث معلوم ہوتی محنت ومشقت برداشت کرکے وہاں پہونچتے اور اطلاع دیتے وہ شخص گھر سے نکل آتا۔ اور کہتا ابن عم رسول! آپ نے کیسے تکلیف کی۔ حضرت ابن عباس فرماتے "میں نے سنا ہے کہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنی ہے" وہ کہتا "ابن عم رسول! آپنے کیوں تکلیف کی کسی اور کو بھیجدیا ہوتا۔ فرماتے نہیں یہ میرا کام تھا۔ اس کے لئے مجھ کو ہی آنا چاہیئے تھا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں انصاری کا حال یہی رہا۔ جب لوگ میرے پاس اکٹھے

ہونے لگے۔ تو انصاری نے کہا یہ نوجوان مجھ سے زیادہ عقلمند تھا[۱]،

ابو رافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اس لئے ان کو اقوال وافعال نبوی سننے اور دیکھنے کا موقع زیادہ ملا تھا حضرت ابن عباس ان کے پاس ایک کاتب کو لیکر آتے اور پوچھتے جاتے کہ بتاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں دن کیا کیا ابو رافع بیان کرتے جاتے اور کاتب قلمبند[۱] کرتا جاتا۔

صحابہ میں آپ کی قدر و منزلت

حضرت ابن عباس کی ذاتی محنت و کوشش، تلاش و جستجو، بہترین تربیت عمدہ ماحول اور پھر سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشفقانہ دعاؤں کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ صحابۂ کرام میں علم و فضل کے اعتبار سے نہایت نمایاں مقام کے مالک ہو گئے اکثر اکابر صحابہ جو عمر اور مرتبہ میں ان سے کہیں زیادہ تھے انہیں بھی ان کے سامنے قصور علم کا عتراف کرنا پڑتا تھا

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا، کا مطلب دریافت کیا انہوں نے اس شخص کو حضرت ابن عباسؓ کے پاس بھیجدیا۔ اس نے پوچھا تو انہوں نے فرمایا۔

"آسمان کا رتق یہ تھا کہ پانی نہ برساتا تھا اور زمین کا رتق یہ تھا کہ اس سے نباتات نہ اگتی تھیں۔ پھر اللہ نے ان میں فتق پیدا کر دیا۔ تو آسمان سے بارش ہونے لگی۔ اور زمین میں نباتات اگنے لگیں۔ سائل نے واپس آکر حضرت ابن عمر کو یہ جواب سنایا تو انہوں نے کہا۔

لقد اوتی ابن عباس علمًا	ابن عباس کو واقعی سچا علم دیا گیا ہے پہلے
صدقًا لقد کنت اَقولُ ما یعجبنی	مجھ کو تعجب ہوتا تھا کہ ابن عباس تفسیر

[۱] مستدرک حاکم ج ۳ فضائل ابن عباس علی شرط بخاری [۲] اصابہ ج ۴ ص ۹۲

جرأة ابن عباس علی تفسیر	قرآن میں کیسی جرأت کرتے ہیں۔
القرآن فالآن قد علمتُ	لیکن اب مجھ کو معلوم ہوگیا کہ واقعی
انه قد اوتی علماً[1]	ان کو علم دیا گیا ہے۔

عمرو بن حبشی کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن عمرؓ سے کسی آیت کا مطلب پوچھا تو بولے "ابن عباسؓ کے پاس جاؤ۔ اب جتنے لوگ بھی باقی ہیں خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نازل کیا تھا۔ ان سب لوگوں میں ابن عباس اس کے سب سے بڑے عالم ہیں[2]

علم بالسنت کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ صحابہ کرام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کے متعلق اختلاف ہوتا تو وہ حضرت ابن عباس کی ہی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک دفعہ صحابہ میں اختلاف اس مسئلہ میں ہوا کہ سرور کونین نے احرام کہاں سے باندھا تھا؟ سعید بن جبیرؓ نے ابن عباسؓ سے کہا "ابو العباس! مجھ کو حیرت ہے کہ صحابہ میں حضور کے احرام باندھنے کی جگہ سے متعلق اتنا شدید اختلاف ہے" آپ نے فرمایا "اس مسئلہ میں میری معلومات سب سے زیادہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی حج کیا تھا۔ اس لئے اختلاف اور بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ سبب یہ ہے کہ جب آپ نے مسجد ذو الحلیفہ میں دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد احرام باندھا اور "لبیک" کہنا شروع کیا تو جو لوگ اس وقت موجود تھے انہوں نے اسی کو یاد رکھا پھر جب اونٹنی روانہ ہوئی اور آپ نے پھر لبیک کہا تو جو لوگ اس وقت موجود تھے۔ وہ یہ سمجھے کہ آپ نے یہیں سے ابتدا کی ہے۔ پھر جب آپ بلند مقام پر چڑھے اور لبیک کہنا شروع کیا تو جو لوگ اس وقت آکر ملے وہ سمجھے کہ آپ نے ابتدا یہیں سے کی ہے لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ نے مسجد میں احرام باندھا۔ اس کے بعد جب اونٹنی روانہ

---

[1] اصابہ ج ۴ ص ۹۲ [2] ایضاً ص ۹۳

ہوئی اس وقت۔ اور جب بلند مقام پر چڑھے تب دونوں مرتبہ لبیک کہتے رہے[۱]۔

یہ اور اس طرح کے دسیوں واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام بڑے بڑے صحابہ حضرت ابن عباسؓ کی جلالتِ علم و کمال فضیلت کے معترف تھے۔ اور عمر میں ان سے کم ہونے کے باوجود وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کسی نے ایک مرتبہ بھی ان پر عدم اعتماد کا اظہار نہیں کیا۔ اپنے مختلف فیہ مسائل میں انہیں کی طرف رجوع کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ ایسے مردم شناس متشدد فی الاسلام بزرگ حضرت ابن عباسؓ کی کم عمری کے باوجود ان کو شیوخ بدر کی مجلسوں میں برابر کا شریک رکھتے تھے، کسی نے کہا وہ تو ہمارے لڑکوں کے برابر ہیں، آپ نے فرمایا "تم ان کا مرتبہ جانتے ہو"[۲]۔

روایت میں احتیاط اس علم و فضل اور کمال و مہارت کے باوجود روایت کے معاملہ میں بے انتہا محتاط واقع ہوئے تھے۔ وہ حدیث بیان کرتے وقت اس کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ کوئی غلط روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے۔ پہلے کسی مقام پر گذر چکا ہے جب لوگوں نے رطب و یابس ہر قسم کی روایتیں بیان کرنی شروع کر دیں تو حضرت ابن عباسؓ نے روایت بیان کرنا ہی ترک کر دیا[۳]۔

وہ لوگوں سے فرماتے تمہیں قال رسول اللہ کہتے وقت یہ خوف دامنگیر نہیں ہوتا کہ تم پر عذاب نازل ہو جائے یا زمین شق ہو جائے اور تم اس میں سما جاؤ[۴]

مرویات کی تعداد عموماً کہا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباس کثیر الروایت تھے۔ لیکن ان سے جو روایتیں مروی ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۶۶۰ بتائی جاتی ہے جن میں سے ۵، متفق علیہ

---

[۱] ابوداؤد کتاب المناسک باب وقت الاحرام [۲] بخاری کتاب التفسیر باب قولہ فسبح بحمد ربک
[۳] صحیح مسلم باب النہی عن الروایۃ عن الضعفاء [۴] مسند دارمی باب ماتیقی من تفسیر حدیث النبی صلعم

ہیں یعنی ان کو امام بخاری اور مسلم دونوں نے اپنی صحیحین میں نقل کیا ہے ان کے علاوہ ۱۸ روایتوں میں امام بخاری منفرد ہیں اور ۹۴ میں امام مسلم[1]۔

حضرت ابن عباس نے ۶۸ھ میں بعمر ۷۱ سال اس جہان فانی کو الوداع کہا اب اگر آپ کی یہ عمر پیش نظر رکھی جائے۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی آپ کے شوقِ تحصیل علم، محنت و جستجو۔ اور شب و روز کی مصروفیت و انہماک کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیثوں کی یہ تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اور دراصل یہ بھی حضرت ابن عباس کی غایت احتیاط کا نتیجہ ہے۔

اس تفصیل سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن عباسؓ پر ایک خاص نظر شفقت و تربیت رکھتے تھے۔

(۲) علم و فضل میں آپ کا مرتبہ نہایت اعلیٰ تھا

(۳) صحابہؓ میں آپ کو بڑی وقعت و منزلت حاصل تھی۔

(۴) روایت میں حضرت ابن عباس حد درجہ محتاط واقع ہوئے تھے اب ان سب حقیقتوں کے پیش نظر بتاؤ کہ کیا ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت ابن عباس پر شک و شبہ کا اظہار کیا جاسکتا ہے؟ یہاں سوال اس کا نہیں ہے کہ بعد والے لوگوں نے روایتوں میں کیا خلط ملط پیدا کر دیا۔ جس کی وجہ سے تمام مرویاتِ ابن عباس درجۂ قبول حاصل نہیں کرسکیں یہاں تو صرف ثابت یہ کرنا ہے کہ صحابہؓ میں جو بزرگ کثیر الروایت تھے۔ اور جن کی کثرت روایت ہی مستشرقین کی نظر میں شک و شبہ کا باعث ہوتی ہے۔ وہ کس پایہ کے بزرگ تھے؟

[1] تہذیب الکمال ص ۲۰۲

اور کیا ان بزرگوں کی کثرت روایت کے باعث یہ کہا جا سکتا ہے کہ عہد صحابہؓ میں احادیث کا ذخیرہ اتنا مشتبہ ہو گیا تھا کہ بعض بڑے بڑے صحابہؓ بھی اس سے مبرا قرار نہیں دیئے جا سکتے؟

صحابہؓ سب عادل ہیں | حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ یہی دو جلیل القدر صحابی ہیں جن پر ان کی کثرتِ روایت کی وجہ سے بعض گستاخوں نے زبان اعتراض کھولی ہے ان کے علاوہ جو صحابہ کرامؓ ہیں ان پر نہ کچھ ایسے زیادہ اعتراضات کئے گئے ہیں اور نہ فرداً فرداً ان میں سے ہر ایک پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ائمہ اسلام نے جرح و تعدیل کے جو اصول مقرر کئے ہیں صحابہ کرامؓ کی مقدس ذات ان سے بہت بلند و بالا ہے۔ اور وہ سب کے سب عدول اور ثقہ ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ کے مقدمہ میں فصل ثالث کے ماتحت اسپر تفصیلی بحث کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا اقتباس درج کیا جائے فرماتے ہیں۔

"سب اہل سنت اس پر متفق ہیں۔ کہ تمام صحابہؓ عادل ہیں، چند مبتدع لوگوں کو چھوڑ کر کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے خطیب نے کفایہ میں اسپر ایک نفیس فصل لکھی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کی عدالت تو اس لئے ثابت ہے کہ خود خدا نے ان کی تعدیل کی ہے اور ان کی طہارت و پاکیزگی کی خبر دی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کنتم خیر امۃٍ اُخرجت للناس اور وکذٰلک جعلنٰکم امۃً وسطاً۔ اور لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم۔ والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسانٍ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔ یا ایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المؤمنین۔ للفقراء المھاجرین الذین اُخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلاً

من اللہ ورضوانا وینصرون اللہ ورسولہ اولئک ھم الصادقون،

یہ اور ان کے علاوہ اور آیات کثیرہ اور احادیث صحیحہ ہیں جن سے صحابہؓ کی عدالت و ثقاہت یقینی طور پر معلوم ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی اس تعدیل کے بعد اب وہ انسانوں میں سے کسی کی تعدیل کے محتاج نہیں ہیں اور اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے صحابہ کرامؓ کی تعدیل میں یہ آیات و احادیث نہ وارد ہوتیں تب بھی ان کی بے مثل خدمات اسلام یعنی ہجرت، جہاد اسلام کے لئے، جان و مال کی قربانی، آباء اور ابناء کا قتل، دین میں خیر خواہی و خیر اندیشی، قوت ایمان و یقین۔ ان کی عدالت و نزاہت کا اور اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی ہیں کہ وہ اپنے بعد میں آنیوالے لوگوں۔ اور تمام تعدیل کرنیوالوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ تمام علماء کا مسلک یہی ہے ابو زرعہ رازی کہتے ہیں۔ جب تم کسی شخص کے متعلق سنو کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی کی تنقیص کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول حق ہے، قرآن حق ہے اور جو کچھ قرآن مجید لایا ہے وہ حق ہے اور یہ سب کچھ ہم تک صحابہ کرامؓ کی وساطت سے ہی تو پہونچا ہے اور یہ لوگ (صحابہؓ پر جرح کرنیوالے) چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں (صحابہؓ) پر جرح کریں تاکہ اس طریقہ سے کتاب و سنت کو ناقابل اعتبار قرار دیدیں۔ یہ لوگ خود اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان پر جرح کی جائے۔ یہ زنادقہ ہیں۔

صحابہؓ کی فضیلت میں احادیث بھی بہت کثرت سے آئی ہیں مثلاً

ترمذی اور ابن حبان نے اپنے "صحیح" میں عبداللہ بن مغفل کی حدیث نقل کی ہے کہ میرے اصحاب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اللہ سے ڈرو۔ ان کو اپنے طعن و تشنیع کا نشانہ نہ بناؤ جو شخص ان سے محبت رکھتا ہے وہ مجھ سے محبت رکھنے کے باعث ان سے محبت کرتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے جس نے ان کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی۔ اور جس نے مجھ کو تکلیف پہنچائی اس نے اللہ کو تکلیف پہنچائی اور قریب ہے کہ اللہ اس کو اپنی گرفت میں لیلے۔[1]

ابو محمد بن حزم فرماتے ہیں۔

سب صحابہؓ یقیناً اہل جنت ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا وکلا وعد اللہ الحسنیٰ" اور ایک جگہ ارشاد ہے ان الذین سبقت لھم منا الحسنیٰ اولئک عنھا مبعدون، پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ تمام صحابہ اہل جنت ہیں اور ان میں سے کوئی نار میں داخل نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان آیتوں کا خطاب انہیں سے ہے۔

عبداللہ بن ہاشم الطوسی بروایت وکیع بیان کرتے ہیں کہ حضرت سفیان فرماتے تھے "قل الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ" میں عبادہ الذین اصطفیٰ سے مراد صحابہ کرامؓ ہیں۔[2]

حافظ ابن حجر نے اپنی تقریر میں ابوزرعہ رازی کے حوالہ سے جو قول نقل کیا ہے

---

[1] اصابہ فی تمیز الصحابہ مقدمہ ص ۶، ۷، ۸ مطبوعہ مصر ۲ بحوالہ مقدمہ اصابہ

عقلی اعتبار سے وہ عدالت صحابہؓ کی قوی ترین دلیل ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر جماعت میں چند لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس جماعت کی عملی تشکیل کرتے ہیں اس کے لئے قواعد و ضوابط وضع کرتے ہیں۔ اور اس کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے ہر بڑی سے بڑی قربانی کے پیش کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے جماعتی اصول کے مطابق یہ لوگ ہر قسم کی تنقید سے بلند و بالا ہوتے ہیں اور ہونا بھی چاہیئے۔ کیونکہ اگر ان پر بھی اصولِ جرح و تعدیل جاری کئے جائیں تو پھر وہ جماعت جماعت باقی نہیں رہ سکتی۔

یہ ظاہر ہے کہ ہم تک کتاب و سنت کا جو کچھ ذخیرہ پہونچا ہے حضرات صحابہ کرام کی وساطت سے ہی پہونچا ہے۔ اگر ان پر بھی اور لوگوں کی طرح جرح و تعدیل کی جائے گی۔ تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ سنت کا کیا ذکر خود قرآن مجید بھی (معاذ اللہ) ناقابل اعتبار قرار پا جاتا ہے کیونکہ قرآن مجید کے قابل اعتماد ہونے کی دلیل آپ کے پاس بجز اس کے کوئی نہیں ہے کہ وہ نقل متواتر کے ذریعہ ہم تک پہونچا ہے، نقل متواتر کی تعریف یہ ہے کہ ہر زمانہ میں اس روایت کو ایسی کثیر جماعت نے نقل کیا ہو کہ ان سب کا کذب پر متفق ہو جانا عادۃً محال ہو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ جماعت افراد سے مرکب ہوتی ہے۔ اور چونکہ ہر ہر فرد میں کذب بیانی کا احتمال ہے۔ اس لئے جماعت میں بھی اس بات کا احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ سب کی سب کذب پر متفق ہو گئی ہو۔ اور سب سے پہلی جماعت جس نے قرآن مجید نقل کیا صحابہ کی ہی ہے۔ پس اگر صحابہ کی جماعت کو جرح و تعدیل سے بلند و بالا نہ تسلیم کیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کیا ہو گا کہ خود قرآن نقل متواتر کے باوجود معرض شک و شبہ ہو جائے۔ اور ظاہر ہے اس کو منکرین حدیث بھی داشت نہیں کر سکتے! فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْن چنانچہ حافظ ابن صلاح فرماتے ہیں۔

ثم ان الامۃ مجمعۃ علی تعدیل — پھر امت کا تمام صحابہ کی تعدیل پر اتفاق ہے اور

جمیع الصحابۃ ومن لابس	جو صحابہ فتنوں کے ساتھ دوچار ہوئے
الفتن منھم فکذالک	ہیں وہ بھی ان میں سے ہی ہیں۔ اور
باجماع العلماء الذین یعتد	یہ فیصلہ صحابہ کے ساتھ حسن ظن اور ان
بھم فی الاجماع احسانا للظن	کے فضائل ومکارم کو پیش نظر رکھنے کی وجہ
بھم ونظرا الی ما تعھد لھم	سے ہے۔ اور چونکہ یہ مقدس حضرات
من المآثر وکان اللہ سبحانہ	شریعت کے نقل کرنے والے ہیں اس لئے
وتعالیٰ اتاح الاجماع علی ذالک	اللہ تعالیٰ نے گویا ان کی عدالت پر امت
لکونھم نقلۃ الشریعۃ[1]	کا اجماع مقرر کر دیا۔

امام غزالی فرماتے ہیں۔

سلف امت اور جمہور خلف کا اس پر اتفاق ہے کہ صحابہ کی عدالت اس لئے ثابت ہے کہ خود اللہ نے ان کی تعدیل اور ان پر ثنا کی ہے۔ پس یہی ہمارا اعتقاد ہے[2]

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر صحابہ کے کسی فعل پر نکتہ چینی کرنے اور ان میں سے کسی کی شان میں گستاخانہ کلمات کے کہنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔

عدالت سے مراد لیکن یہاں اس امر کی تصریح کر دینی ضروری ہے کہ صحابہ کی عدالت سے مراد کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اصولِ حدیث کی اصطلاح میں عدالت کے معنی جھوٹ نہ بولنا ہیں۔ پس ہم صحابہ کو جو عادل کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ بے گناہ اور معصوم ہیں بلکہ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کی طرف کذب کا انتساب نہیں کیا جا سکتا

---

[1] مقدمۂ ابن صلاح ص ۲۶۰ [2] المستصفیٰ جزء ۱ ص ۱۶۵

یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی صحابیؓ نے عمداً و قصداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی ہے جو آپ نے نہیں فرمائی اس کا دعویٰ کسی محدث نے نہیں کیا کہ صحابہؓ انبیاءؑ کی طرح معصوم ہیں اور ان سے احتیاط و تقویٰ کے خلاف کوئی فعل صادر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ ابن انباری کا قول ہے۔

لیس المراد بعدالتھم ثبوت	تہمتوں کے بُعد سے یہ مراد نہیں کہ صحابہؓ
العصمۃ لھم واستحالۃ المعصیۃ	بالکل معصوم ہیں اور ان سے معصیتوں کا صادر
منھم وانما المراد قبول روایاتھم	ہونا محال ہے بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ اسباب
من غیر تکلف البحث عن اسباب	عدالت اور تزکیہ کی طلب سے متعلق بحث کے
العدالۃ وطلب التزکیۃ الا	بغیر انکی روایتیں قبول کی جائیں گی۔ مگر ہاں
ان یثبت ارتکاب قادح ولم	اس صورت میں جبکہ کسی امر قادح کے ارتکاب کا
یثبت ذلک[1]	ثبوت بہم پہونچ جائے۔ اور یہ ثابت نہیں ہے

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں۔

"اہل سنت کا یہ مقررہ عقیدہ ہے کہ صحابہؓ کل کے کل عادل ہیں۔ یہ لفظ بار بار بولا گیا ہے اور میرے والد مرحوم (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) نے اس لفظ کی حقیقت سے بحث کی تو یہ ثابت ہوا کہ اس موقع پر عدالت کے متداول معنی مراد نہیں ہیں بلکہ صرف عدالت فی روایت الحدیث مراد ہے۔ اس کے سوا اور کچھ مراد نہیں ہے اور اس عدالت کی حقیقت روایات میں جھوٹ بولنے سے بچنا ہے کیونکہ ہم نے تمام صحابہؓ کی سیرت کو خوب ٹٹولا یہاں تک کہ ان لوگوں کی

[1] ارشاد الفحول للشوکانی ص ۶۷

سیرت کا بھی مطالعہ کیا جو خانہ جنگیوں، فتنوں اور لڑائی جھگڑوں میں شریک ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت دروغ بیانی کو سخت ترین گناہ سمجھتے تھے اور اس سے شدت کے ساتھ احتراز کرتے تھے[1]

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ خوب فرمایا کہ جو صحابہؓ خانہ جنگیوں میں مبتلا تھے ان کی سیرت کی اچھی طرح سے جانچ پڑتال کی گئی تو معلوم ہوا کہ روایت میں کذب بیانی سے کام انہوں نے بھی نہیں لیا اس کا اندازہ اس ایک بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ احادیث متواترہ کی تعداد محدثین کے نزدیک بہت ہی کم ہے اور ان ہی میں حدیث من کذب علیّ متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار بھی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں اس حدیث کو قرآن کی طرح شہرت حاصل تھی اور وہ کذب فی روایت الحدیث سے کس درجہ خوف کھاتے تھے۔

عدالت کے معنی کی اس تنقیح کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ہم تمام صحابہ کو عادل مانتے ہیں یعنی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے روایت میں کذب بیانی سے کام نہیں لیا تو اس میں کوئی بات "غیر صحیح اور قرآن کے خلاف نہیں ہے"۔ اور نہ ہمارا یہ فیصلہ محض عقیدتمندی کا فیصلہ ہے۔

---

[1] بحوالہ مقدمہ اسوۂ صحابہ ص ۱۴۔ اسوۂ صحابہ میں یہ عبارت ظفر الامانی مسئلہ سے لی گئی ہے۔

تابعین کا دور

صحابۂ کرام کے بعد تابعین عظام کا دور آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابۂ کرام مختلف شہروں میں متفرق ہو گئے تھے اور اپنے اپنے مقام پر قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے تھے۔ مکہ، مدینہ، شام، بصرہ، کوفہ، یمن، اور مصر ان سب مقامات پر تعلیم قرآن و حدیث کی مستقل درسگاہیں قائم تھیں۔

مدینہ ان سب میں مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ اکابر صحابہ مثلاً حضرت عمرؓ، زید بن ثابتؓ عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ رضی اللہ عنہم یہیں تشریف فرما تھے، مکہ میں حضرت معاذ بن جبلؓ، کوفہ میں حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ بصرہ میں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور انس بن مالکؓ شام میں حضرت معاذؓ، عبادۃ بن الصامتؓ۔ اور حضرت ابو الدرداءؓ مصر میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص علم و فضل کے جواہر لٹا رہے تھے۔ ان کی درسگاہ فیض و ارشاد سے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے جن پر اسلامی علوم و فنون کو رہتی دنیا تک ناز رہے گا۔

یہی تابعین کرام ہیں جو صحابۂ کرام کے علم کے صحیح وارث ہوئے انہوں نے بکمال مشقت اور نہایت محنت و جستجو قرآن و حدیث کا علم حاصل کیا اور اس میں مہارت تامہ پیدا کر کے اس کو محفوظ و مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا۔ تابعین کرام کے مختلف طبقات ہیں علامہ ابن سعد نے طبقات میں پہلے شہر کے لحاظ سے ان کی تقسیم کی ہے۔ پھر ایک شہر کے تابعین میں ثقاہت و عدالت کے لحاظ سے متعدد طبقات قائم کئے ہیں۔ اور ہر طبقہ کے تابعین کے حالات بڑی محنت و جستجو۔ اور تلاش و تحقیق سے جمع کئے ہیں۔

تابعین مدینہ کے طبقۂ اولیٰ میں سب سے زیادہ نمایاں اور مشہور شخصیت حضرت امام محمد بن مسلم معروف بہ ابن شہاب زہری کی ہے۔ صحابہؓ کے بعد علوم قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت جن بزرگوں کی کوششوں کی رہین منت ہے امام زہری کا نام ان کے سرفہرست ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علمی کوششوں کا تذکرہ مختصراً کر دیا جائے۔

امام زہری آپ کا نام محمد تھا اور ابوبکر کنیت۔ والد کا نام مسلم تھا۔ ان کے پردادا عبداللہ بن شہاب زعمائے قریش میں سے تھے۔ انہیں کی نسبت سے امام زہری ابن شہاب کہلاتے ہیں سنہ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔ امام زہری میں تحصیل علم کی استعداد فطری تھی۔ ذہانت و ذکاوت میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ قوت حافظہ غیر معمولی رکھتے تھے[1] اسی دن میں پورا کلام مجید حفظ کر لیا تھا۔ تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ ایک حدیث میں کچھ شبہ ہوا تھا۔ لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ جس طرح انہیں یاد تھی وہ حدیث ویسی ہی تھی[2]

اس غیر معمولی ذہانت و قوت حافظہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے علم کا ذوق جستجو بھی ایسا ہی مرحمت فرمایا تھا۔ اسی طلب میں آٹھ سال تک حضرت سعید بن المسیبؒ کی خدمت میں رہے۔ ابوالزناد کہتے ہیں "ہم علماء کے پاس زہری کے ساتھ جاتے تھے۔ ان کے پاس تختیاں اور صحیفے ہوتے تھے۔ جن میں وہ جو حدیث سنتے تھے لکھتے جاتے تھے۔ امام زہری کا ذوق کسی ایک علم و فن تک محدود نہ تھا۔ بلکہ قرآن۔ حدیث۔ تاریخ۔ اور انساب عرب ان میں سے وہ ہر ایک کا ذوق رکھتے تھے۔ ابوصالح لیث سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے زہری سے زیادہ کسی کو جامع علوم و فنون نہیں دیکھا وہ ترغیب کی حدیثیں بیان کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس سے زیادہ کچھ اور نہ جانتے ہوں گے" پھر عرب اور انساب کے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۰ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۴

متعلق بیان کرنے لگتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب سے بہتر وہ اسی کو جانتے ہیں پھر اگر قرآن و حدیث بیان کرنے پر آجاتے تو اس میں بھی ایسی ہی مہارت دکھاتے تھے۔[1]

کتابت حدیث امام زہری کا حافظہ اگرچہ نہایت قوی تھا لیکن ازراہِ احتیاط وہ پھر بھی احادیث قلمبند کرتے تھے۔ صالح بن کیسان کا بیان ہے کہ "میں تحصیل علم میں زہری کے ساتھ رہتا تھا انہوں نے مجھ سے کہا کہ سنن قلمبند کر لینی چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے تمام سنن لکھ لیں۔ سنن رسول اللہ کو لکھ لینے کے بعد انہوں نے کہا کہ اب سنن صحابہ لکھ لینی چاہیئے لیکن ہم نے ان سنن کو نہیں لکھا اور زہری نے لکھ لیا۔"[2]

بعض محدثین کے بیانات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم سے سب سے پہلے امام زہری نے احادیث کی تدوین کی تھی۔[3] یہ بیان صحیح ہو یا نہ ہو یہ بہرحال یقینی ہے کہ امام زہری نے احادیث کا ایک ضخیم مجموعہ تیار کیا تھا۔ امام شافعیؒ فرماتے تھے "اگر زہری نہ ہوتے تو مدینہ کے سنن ضائع ہو جاتے"۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ فرماتے تھے اب سنت ماضیہ کا جاننے والا زہری سے زیادہ کوئی نہیں ہے"۔[4] اسی قسم کا مقولہ حضرت مکحول سے بھی مروی ہے۔ ایوب السختیانی فرماتے تھے ما رأیت اعلم بن الزہریؒ[5]

حفظ احادیث امام زہری چونکہ کثرت سے روایت کرتے تھے۔ اس لئے بعض لوگوں کو ان پر شبہ ہوتا تھا لیکن جب کبھی ان کا امتحان لیا گیا۔ تمام شکوک و شبہات کا پردہ خود بخود چاک ہو گیا۔

ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے اپنے کسی لڑکے کے واسطے ان سے حدیثیں قلمبند

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۳ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۸ [3] مقدمہ فتح الملہم شرح مسلم ص ۹۲ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۰۳ [5] ایضاً

کرنے کی درخواست کی۔ آپ نے چار سو حدیثیں لکھدیں۔ ایک ماہ کے بعد ہشام نے امتحاناً کہا کہ وہ مجموعہ گم ہو گیا۔ امام زہری نے وہی احادیث پھر لکھوا دیں۔ دونوں کو ملا کر دیکھا گیا تو ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔[1]

مرویات کی تعداد اور ان کا پایہ

احادیث وسنن کا نہ معلوم کتنا ذخیرہ ان کے سینہ میں ہوگا ان سے جو روایتیں مروی ہیں ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔ پھر کیفیت ونوعیت کے اعتبار سے دیکھئے تو ان کا پایہ بہت ہی اعلیٰ ہے۔ عمر بن دینار جو خود جلیل القدر محدث تھے فرماتے تھے "میں نے زہری سے زیادہ کسی کو حدیث میں قطعی فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا"[2] امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں "زہری کی وہ روایات اصح الاسانید ہیں جو انہوں نے سالم سے اور سالم نے اپنے والد عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہیں"[3]

شیوخ

امام زہری نے جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ طلب علم میں ہر چشمہ فضل و کمال سے سیراب ہونے کی کوشش کی تھی اس لئے ان کے شیوخ کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں چند فاضلہ خواتین بھی شامل ہیں۔ صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن جعفرؓ ربیعہ بن عبادؓ، مسور بن مخرمہؓ، انس بن مالکؓ، سہل بن سعدؓ، سائب بن یزیدؓ، شبیبؓ، ابو جمیلہؓ عبدالرحمن بن ازہرؓ، محمود بن ربیعؓ، عبداللہ بن ثعلبہؓ، عبداللہ بن عامرؓ، ابوامامہؓ، سعد بن سہلؓ اور ابوالطفیلؓ اور اکابر تابعین میں حضرت سعید بن المسیبؒ، شعبیؒ، حسن بصریؒ، اور مکحولؒ، امام زہریؒ جتنے بڑے محدث تھے، فقیہ ومفتی بھی تھے چنانچہ انکی وفات کے بعد محمد بن نوح نے ان کے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ص ۱۰۳ و ۱۰۴ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۴۸ [3] تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۹۱

فتاویٰ جمع کئے تو تین جلدوں میں آئے۔[1]

امام زہری کے علاوہ اس عہد کے ائمہ حدیث جن کو سنن و آثار کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت نافع، اعمش، اور قتادہ ہیں۔ امام زہری کے تلامذہ پانچ طبقات پر منقسم ہیں۔

ان طبقات میں سے ہر طبقہ اپنے ماتحت طبقہ پر فضیلت رکھتا ہے۔ پہلے طبقہ میں وہ حضرات داخل ہیں جو عدالت، ثقاہت۔ اتقان اور حفظ میں سب سے ممتاز ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے شیخ کی طویل ملازمت و مصاحبت کا شرف رکھتے ہیں۔ دوسرے طبقہ میں وہ لوگ شامل ہیں جو عدالت اور ثقاہت میں طبقہ اولیٰ کے برابر ہیں۔ لیکن انہیں شیخ کی مصاحبت ان لوگوں کے برابر نصیب نہیں ہوئی۔ تیسرے طبقہ میں وہ بزرگ داخل ہیں جنہوں نے شیخ کی ملازمت تو پہلے طبقہ کے برابر کی ہے۔ لیکن وہ مفسدۂ جرم سے پاک نہیں۔ طبقہ چہارم کا اطلاق اس جماعت پر ہوتا ہے۔ جس کے افراد طبقۂ ثالثہ کے ساتھ جرح و تعدیل میں شریک ہیں اور اس کے ساتھ ملازمت شیخ بھی کچھ زیادہ طویل نہیں رکھتے۔ پانچواں طبقہ ضعفاء اور مجہول رواۃ کا ہے

ان رواۃ میں مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے جو فرق ہے۔ اوسی کے اعتبار سے ان کی روایتوں کے قبول و عدم قبول سے متعلق تشدد اختیار کیا گیا ہے۔ طبقہ اولیٰ کے لوگ چونکہ سب سے اعلیٰ اور افضل ہیں اس لئے امام بخاری صرف انہی کو مستند علیہ قرار دیتے ہیں اور ان ہی کی روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔ کبھی کبھی طبقۂ ثانیہ کے رُوَاۃ کی کوئی حدیث جس کی صحت کا ان کو یقین ہوتا ہے اسے بھی لے آتے ہیں۔ البتہ دوسرا طبقہ، امام مسلم کی شرط پر ہے۔ طبقہ ثالثہ کے رُوَاۃ امام ابوداؤد اور نسائی کی شرط پر ہیں۔ طبقۂ رابعہ کے حضرات امام ابوعیسیٰ ترمذی کی شرط پر ہیں۔ پانچواں طبقہ مجہولین کا ہے اس لئے امام ابوداؤد کے نزدیک جو شخص ابواب کے ماتحت احادیث

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۶

کی تخریج کرتا ہے اس کے لئے ان کی حدیث لینا جائز نہیں ہے۔ البتہ ... اگر اس کو دوسرے ذرائع سے اعتماد حاصل ہو جائے تو پھر اس روایت کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

امام زہری اور ان کے معاصر ائمہ حدیث جن کے تراجم اور علمی کوششوں کے ذکر کا افسوس کہ یہاں موقع نہیں ہے۔ انہوں نے اقوال و افعال نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حفاظت، اور ان کی نشر و اشاعت میں صحابۂ کرامؓ کی صحیح جانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ پھر ان کے تلامذہ نے اپنے اساتذہ کے مسندِ درس و علم کو سنبھالا تو تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے بھی اس ورثۂ علمی کی حفاظت تنقیح و تحقیق اور اس کی اشاعت و توسیع میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور اس کو ہر امکانی کوشش کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ محفوظ و مامون کر دیا۔ یہ سلسلہ تدوین کے دور تک برابر جاری رہا۔

تیسری صدی ہجری میں جب "دورِ تدوین" کا آغاز ہوا تو اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اب تک احادیث فقہ سے الگ نہیں تھیں۔ اور اسی بنا پر لوگ سنت کے ساتھ اقوال صحابہ کو بھی ملائے رکھتے تھے۔ لیکن اب خیر القرون کے ختم ہونے کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ حدیث کو بحیثیت ایک فن کے مدوّن کیا جائے، تو اقوال صحابہ کو سنت سے خارج قرار دیا گیا اور خود حدیث کی صحت معلوم کرنے کے لئے روایت کے قبول و عدم قبول کا معیار باقاعدہ طور پر مقرر کیا گیا۔ راویوں کا ایک ایک حال بڑی محنت و کوشش سے معلوم کیا۔ اسباب جرح و تعدیل کی تعیین ہوئی۔ حدیث کی متعدد قسمیں کی گئیں، اور ان سب امور کی تکمیل کے لئے متعدد علوم و فنون مدوّن ہوئے جن کے حصار میں آج علم حدیث ہر قسم کے شکوک و شبہات سے دور نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔

اسناد صحابۂ کرام کے عہد میں کسی روایت کی توثیق کا قاعدہ یہ تھا کہ راوی سے شہادت

طلب کی جاتی تھی۔ تابعین کے عہد میں صرف شہادت کافی نہیں ہوسکتی تھی اس لئے اسناد کا سلسلہ قائم کیا گیا۔ یعنی جب کوئی راوی روایت بیان کرتا تھا تو اسے بتانا پڑتا تھا کہ اس نے وہ روایت کس سے سنی ہے۔ اور اس نے کس سے سنی تھی یہانتک کہ وہ سلسلہ صحابیؓ تک پہونچ جاتا تھا بڑے بڑے ائمہ اس کا التزام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امام زہریؒ جن کی فراست وثقاہت میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے حضرت سفیان بن عیینہؒ سے ایک حدیث بیان کی۔ اور اس کے ساتھ اسناد بھی بیان کرنی شروع کی۔ تو سفیان بولے، آپ سند رہنے دیجئے امام زہری نے فرمایا "کیا آپ بغیر سیڑھی کے چھت پر چڑھنا چاہتے ہیں[1]؟" تاہم معلوم ہوتا ہے کہ تابعین کے دور اولین میں اسناد کا عام طور پر زیادہ اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن جب طرح طرح کے فرقے پیدا ہوگئے اور بعض شریر النفس لوگوں نے اپنے عقائد باطلہ کو ثابت کرنے کے لئے احادیث وضع کرنی شروع کیں تو سند حدیث کی روایت کے لئے ایک لازمی اور اہم شرط قرار دیدی گئی۔ محمد بن سیرینؒ کا قول تھا

ان هذا العلم دین فانظروا عمن	یہ علم دین ہے تم دیکھو کہ اپنے دین کو کس
تاخذون دینکم	سے حاصل کر رہے ہو۔

پھر فرماتے ہیں۔

لم یکونوا یسئلون عن الاسناد	پہلے لوگوں سے اسناد کے متعلق سوال نہیں کیا جاتا تھا
فلما وقعت الفتنة قالوا سموا	پھر جب فتنہ واقع ہوگیا تو محدثین نے کہا ہم سے اپنے
لنا رجالکم فینظر الی اهل السنة	راویوں کے نام بیان کرو تاکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ اہل سنت
فیؤخذ حدیثهم وینظر الی اهل البدع[2]	میں سے ہیں یا نہیں اگر ہیں تو انکی حدیث قبول کرلی جائے اور اگر
فلا یؤخذ حدیثهم	وہ اہل بدعت میں سے ہیں تو انکی حدیث ترک کر دی جائے۔

۱؎ تدریب الراوی ۲؎ مقدمہ صحیح مسلم

حضرت سفیان ثوری فرماتے تھے راویوں نے جھوٹ کی آمیزش شروع کر دی تو ہم نے تاریخ سے کام لینا شروع کر دیا، حسان بن زید کہتے ہیں۔

"کذابین کے لئے تاریخ سے بڑھ کر ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ میں شیخ سے اس کا سن دریافت کرتا ہوں اس کی تاریخ پیدائش پوچھتا ہوں اگر وہ سچ سچ بتا دیتا ہے تو ہم اس کے صدق و کذب میں تمیز کر لیتے ہیں۔

حسن بن الربیع کہتے ہیں "ایک بار میں بغداد گیا۔ جب میں واپس ہونے لگا تو انھوں نے حدیث دور تک میری مشایعت کو آئے۔ میں باہر پہونچا تو انہوں نے کہا ذرا ٹھہر جائیے احمد بن حنبل آرہے ہیں۔ میں بیٹھ گیا۔ جب وہ آئے تو مجھ سے پوچھا کہ عبداللہ بن مبارک کا کس سنہ میں انتقال ہوا تھا؟ میں نے کہا ۱۸۱ھ میں۔ جب امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا گیا کہ آپ کا اس سوال سے کیا مطلب تھا؟ تو فرمایا "میں کذابین کی شناخت اسی طرح کرتا ہوں"[1]

اسناد کی اہمیت اسناد کو علم حدیث میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ عبداللہ بن مبارک فرماتے تھے "اسناد دین کا جز ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو جس کے جی میں جو آتا کہہ گذرتا"[2]

علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں "اصل اسناد اس امت کے خصائص میں سے ہے اور سنن موکدہ میں سے ایک بہت بڑی سنت ہے" ائمہ حدیث کو اسناد عالی کی طلب اتنی ہوتی تھی کہ نفس واپسیں کے وقت بھی جبکہ انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا ہے اسے فراموش نہیں کرتے تھے۔ یحیی بن معین کا انتقال ہونے لگا تو کسی نے ان سے پوچھا۔ اس وقت

---

[1] ابن عساکر ص ۲۶ [2] مقدمہ ابن صلاح ص ۲۱۵

آپ کی تمنا کیا ہے؟" فرمایا "ایک تنہا مکان اور ایک عالی اسناد"۔ محمد بن اسلم الطوسی نے کہا ہے "اسناد کا قرب گویا کہ اللہ کا قرب ہے"[1]۔ قرآن مجید میں جو ایک مقام پر "او اثارۃ من علم" آیا ہے۔ حاکم وغیرہ نے مطر الوراق سے نقل کیا ہے کہ اس کا مصداق علم اسناد الحدیث ہے[2]؛

جس روایت کا سلسلہ ثقہ راویوں کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتا تھا اُسے درجۂ قبول حاصل نہیں ہوتا تھا ابو اسحاق ابراہیم بن عیسی بیان کرتے ہیں "ایک مرتبہ میں نے عبداللہ بن مبارک سے ایک حدیث "ان من البر بعد البر ان تصلی لابویک مع صلوٰتک وتصوم لهما مع صومك" کی نسبت دریافت کیا تو انہوں نے پوچھا تم نے یہ حدیث کس سے سنی ہے؟ میں نے کہا "شہاب بن خراش سے" فرمایا "وہ تو ثقہ ہیں اور شہاب نے کس سے لی ہے؟ میں نے کہا "حجاج بن دینار سے فرمایا وہ بھی ثقہ ہیں لیکن انہوں نے کس سے لی ہے؟ میں نے کہا وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں عبداللہ بن مبارک نے یہ سن کر کہا "اے ابو اسحاق حجاج بن دینار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تو بڑے بڑے جنگل ہیں جن میں اونٹنیوں کی گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں[3]۔

اسماء الرجال کی تدوین اس علم اسناد الحدیث کی وجہ سے ہی رواۃ حدیث کے حالات وسوانح کی چھان بین کی گئی۔ ان کے اخلاق و اعمال کے ایک ایک گوشہ کی بکمال احتیاط و دیدہ دری تحقیق و تفتیش کی گئی جس سے "اسماء الرجال" کا وہ عظیم الشان فن مدون ہو گیا۔ جس کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ جرمنی کے مشہور فاضل مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر جنہوں نے حافظ ابن حجر کی کتاب کی تصحیح کی ہے اصابہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو۔ جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے[4]"

---

[1] مقدمہ ابن صلاح ص ۲۱۶ [2] التقیید والایضاح ص ۲۱۵ [3] مقدمہ صحیح مسلم باب الکشف عن معایب رواۃ الحدیث
[4] بحوالہ سیرت النبی ج ۱ ص ۳۵ - یہ حوالہ پہلے بھی ایک جگہ گذر چکا ہے۔

محدثین نے اس کٹھن راہ میں جس انتہائی جفاکشی۔ دیانت داری اور صلاح و تقوی کا ثبوت دیا ہے بے شبہ اس کو اسلام کا ایک معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے جرح و تعدیل کا جو معیار مقرر کیا تھا اس پر بادشاہوں سے لیکر بڑے سے بڑے ائمہ مذہب کو پرکھا۔ اور اس راہ میں نہ ان کو کوئی دنیوی طاقت و حشمت مرعوب کر سکی۔ اور نہ وہ کسی کی مذہبی قیادت و پیشوائی سے خوفزدہ ہوئے۔ جس شخص میں کوئی ذرا سا نقص بھی دیکھا اسکو برملا اور علی الاعلان کہا کہ لوگ اس کی روایتیں قبول کرنے میں احتیاط برتیں۔ علی بن شقیق کہتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ عبداللہ بن مبارک کو دیکھا کہ ایک بھرے مجمع میں کہہ رہے تھے۔

"لوگو! عمر بن ثابت کی حدیثیں مت قبول کرو یہ سلف کی شان میں گستاخیاں کرتا ہے[1]"۔

یحیی بن سعید کہتے ہیں۔ میں نے حضرت سفیان ثوری۔ شعبہ، مالک اور ابن عیینہ سے پوچھا کہ اگر ایک شخص حدیث میں لائق اعتماد نہ ہو اور مجھ سے کوئی شخص اس کے متعلق دریافت کرے تو میں کیا کہوں؟ سب نے بالاتفاق کہا۔ تم صاف صاف کہدو کہ وہ لائق اعتبار نہیں ہے[2]"۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ایک فصل کے ماتحت اسپر مفصل کلام کیا ہے اور علماء و محدثین کے اقوال سے ثابت کر دیا ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق کوئی ذرا سا شبہ بھی ہو تو اس کی حدیث قبول نہ کرنی چاہیئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا اعلان عام کر کے لوگوں کو اس کے فتنہ و شر سے بچانے کی کوشش بھی کرنی چاہیئے"۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کسی کے تدین اور تشرع کو بھی تثبت فی روایت الحدیث کا معیار قرار نہیں دیا گیا۔ امام یحیی بن سعید القطان جو فن جرح و تعدیل کے بے نظیر امام ہیں فرماتے ہیں۔

---

[1] مقدمہ صحیح مسلم [2] مقدمہ صحیح مسلم

لم نر الصالحين في شيء اكذب — صالحین کسی چیز میں اتنا جھوٹ نہیں

منهم في الحديث[1] — بولتے جتنا کہ وہ حدیث میں بولتے ہیں۔

امام مسلم اس کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ یہ لوگ عمداً جھوٹ نہیں بولتے بلکہ ان کی زبان سے خلاف واقع الفاظ نکل ہی جاتے ہیں۔

معن بن عیسی بیان کرتے ہیں کہ امام مالک فرماتے تھے چار شخصوں کی حدیث بالکل نہ قبول کی جائے۔ ایک بے وقوف کی، دوسرے اس شخص کی جو اپنی خواہشات کا بندہ ہو اور لوگوں کو ان کی دعوت دیتا ہو، تیسرے اس شخص کی جو جھوٹا ہو اور اگرچہ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کذب بیانی کا ثبوت نہ پہونچا ہو۔ لیکن لوگوں کی بات چیت میں جھوٹ سے احتراز نہ کرتا ہو۔ اور چوتھے اس صاحب فضل و عبادت اور صاحب صلاح و تقوی کی حدیث بھی قبول نہ کی جائے جو اس حدیث کو جانتا ہی نہ ہو جسے وہ بیان کرتا ہے[2]"

محدثین کو کسی کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص روایت کے قبول کرنے میں راوی کی جانچ پڑتال اور اس کے حالات کی تحقیق نہیں کرتا تو وہ اس کو بھی خواہ وہ اپنی ذات سے کیسا ہی راست گفتار ہو۔ ناقابل اعتبار قرار دیتے تھے۔ عبداللہ بن مبارک نے ایک راوی بقیہ کی نسبت فرمایا۔

صدوق اللسان ولکنه یاخذ — زبان کا سچا ہے۔ لیکن وہ ہر کہ دمہ کی

عمن اقبل وادبر[3] — روایت قبول کرتا ہے۔

اسماء الرجال کی کتابیں محدثین نے اس فن کو اس درجہ ترقی دی کہ رواۃ کے احوال میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں تصنیف کیں۔ پھر جو راوی ضعیف یا مجہول تھے ان کے احوال میں الگ اور جو معتبر

[1] مقدمہ صحیح مسلم [2] توجیہ النظر ص ۲۶ [3] ایضاً

وثقہ تھے ان کے حالات میں الگ کتابیں لکھیں۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں[1]

سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح وتعدیل میں یحیی بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی۔ وہ اس مرتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا۔ ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

نام مصنف	کیفیت
رجال عقیلی	خاص ضعیف الروایت لوگوں کے حال میں ہے
رجال احمد بن عبد العجلی متوفی ۲۶۱ھ	اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے
رجال امام عبد الرحمن بن حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ	بہت ضخیم کتاب ہے
رجال امام دار قطنی	مشہور محدث ہیں یہ کتاب خاص ضعیف الروایت اشخاص کے حال میں ہے۔
کامل ابن عدی	اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔

یہ کتابیں آج نہیں ملتیں لیکن بعد کی تصنیفات جو ان ہی سے ماخوذ ہیں وہ دستیاب ہوتی ہیں ان میں زیادہ مشہور یہ ہیں

تہذیب[1] الکمال۔ تہذیب[2] التہذیب۔ لسان[3] المیزان۔ تقریب[4]۔ تاریخ کبیر بخاری[5] تاریخ صغیر بخاری[6]۔ ثقات[7] ابن حبان۔ تذکرۃ[8] الحفاظ۔ مشتبہ[9] النسبۃ۔ الانساب[10] سمعانی تہذیب[11] الاسماء واللغات۔ میزان[12] الاعتدال۔ کتاب[13] الاسماء والکنی

[1] مقدمہ سیرت النبی ص ۳۶

ظاہر ہے کہ ایک روایت کے تمام راویوں کے متعلق ایک ایک جزئی کو معلوم کرنا سخت مشکل کام تھا۔ لیکن بہ قول علامہ شبلی اس کام کے لئے سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں صرف کردیں ایک ایک شہر میں گئے راویوں سے ملے ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہونچائے جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیئے۔

راویوں کے مختلف حالات اور بعض دوسرے امور کی وجہ سے ہی احادیث کی متعدد قسمیں قرار دی گئیں اور ان کو صحیح وضعیف وغیرہ پر تقسیم کیا گیا۔ ہم صرف حدیث صحیح کی تعریف بیان کریں گے اور باقی اقسام کا ذکر اسی ضمن میں آجائے گا۔

حدیث صحیح محدثین کے نزدیک صحیح حدیث وہ ہے۔ جس کی اسناد راوی سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو یعنی درمیان میں سے منقطع یا مرسل نہ ہو، اور اس کو ایک ایسے شخص نے نقل کیا ہو جو عادل ہو ضابط ہو۔ اور جس میں کسی قسم کا شذوذ یا علت نہ پائی جاتی ہو۔

عدالت عدالت کی تعریف میں اختلاف ہے۔ چنانچہ علامہ طاہر الجزائری فرماتے ہیں۔ تمام چیزوں میں سب سے زیادہ مشکل عدالت کو پہچاننا ہے، امام غزالی مستصفیٰ میں فرماتے ہیں وعدالت ایک ایسا ملکہ ہے جس کے ذریعہ انسان کبائر کے ارتکاب اور صغائر پر اصرار سے اجتناب کرتا ہے۔ بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عدالت کبائر اور صغائر دونوں سے باز رکھتی ہے بعض کہتے ہیں کہ "جس شخص میں مروت اور طاعت غالب ہو وہ عادل ہے، ان تعریفوں کی بنا پر ایک وہ شخص جو کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جس سے اس کے دین کی رکاکت پر استدلال کیا جاسکتا ہو۔ مثلاً بازار میں کھانا۔ بازار میں پیشاب کرنا۔ عام لوگوں کے ساتھ ہنسی اور ٹھٹھول کرنا اس کو پایۂ عدالت سے ساقط سمجھا جائے گا۔

حافظ ابن تیمیہ نے سب سے الگ ایک نئی بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں "عدالت ہر زمانہ اور مکان میں اور ہر قوم میں اس کے ہی اعتبار سے ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر قوم میں شاہد وہی ہوتا ہے جو اس کے اپنے معیارِ عدالت کے مطابق ہو۔ اسی اعتبار سے لوگوں میں حکم کرنا ممکن ہے ورنہ اگر ہر طائفہ میں شاہدوں کے لئے ادارِ واجبات اور ترک محرمات کی قید لگا دیجائے تو تمام یا اکثر شہادتیں باطل ہو جائیں"[۱]

حق یہ ہے کہ امام ہمام نے بہت ہی حکیمانہ اور فیصلہ کن بات کہی ہے۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ عدالت عدالت میں فرق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کسی مقدمہ میں گواہی دینے کے لئے جس عدالت کی ضرورت ہے اس کا معیار اتنا سخت نہیں ہو سکتا جتنا کہ اس عدالت کا۔ جو روایت حدیث کے قبول کیلئے ضروری ہے۔ اب اگر عدالت کے تمام مختلف معیاروں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ سخت معیار اس عدالت کا ہے جو راوی حدیث کے لئے ضروری ہے۔ "اسمٰعیل بن ابی اویس کہتے ہیں "میں نے ایک مرتبہ اپنے ماموں امام مالک سے سنا فرما رہے تھے۔ میں نے ستر ایسے آدمیوں سے ملاقات کی ہے جنہوں نے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر مسجد نبوی کے، ان ستونوں کے پاس حدیث بیان کی، لیکن میں نے ان کی کوئی حدیث قبول نہیں کی۔ حالانکہ ان میں سے ایک ایک شخص اتنا بڑا امین تھا کہ اگر اس کو بیت المال کا انچارج بنا دیا جاتا تو وہ اس کے حق میں امین ہی ثابت[۲] ہوتا۔ اس ایک واقعہ کی طرح کتب اسماء الرجال میں سینکڑوں واقعات مل سکتے ہیں جن سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ محدثین کے نزدیک عدالت کا جو معیار ہے وہ کس قدر سخت اور اونچا ہے۔

یہاں یہ معلوم کرنا بھی خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ کہ محدثین نے راوی کے لئے عدالت کی جو شرط

---

[۱] توجیہ النظر ص ۲۹ [۲] توجیہ النظر ص ۲۶

لگائی ہے وہ خود قرآن سے مستنبط ہے۔ ارشاد گرامی ہے۔

یاایہاالذین امنواان جاء کم	اے ایمان والو اگر تمہارے پاس کوئی فاسق
فاسق بنباء فتبینوا الآیہ	کوئی خبر لیکر آئے تو اس کی خوب تحقیق کرو۔

ایک موقع پر ہے۔

واشہدوا ذوی عدل منکم	اپنے میں سے دو صاحب عدل انسانوں کی شہادت پیش کرو۔

عدالت کے اعتبار سے طبقاتِ رواۃ | علامہ جزائری فرماتے ہیں "صحیح یہ ہے کہ ضبط و حفظ کی طرح عدالت بھی زیادتی اور نقصان قوت اور ضعف کو قبول کرتی ہے۔ اسی بنا پر علامہ نجم الدین سلیمان الطوفی نے شرح الاربعین میں بیان کیا ہے کہ روایت کا دار و مدار راوی کے عدل و ضبط پر ہے پس جو حضرات ان دونوں وصفوں میں مرتبۂ اعلیٰ پر ہوں گے۔ جیسے حضرت شعبہ، سفیان۔ اور یحیی بن سعید القطان وغیرہ اُن کی حدیث صحیح ہو گی۔ اور اگر راوی عادل و ضابط تو ہے لیکن مرتبۂ اعلیٰ پر نہیں اس کی روایت حسن ہو گی عدالت اور ضبط کے تفاوت کے اعتبار سے رواۃ کو نو طبقات پر تقسیم کیا گیا ہے[1] جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ضبط | صحت حدیث کے لئے دوسری شرط ضبط ہے۔ علامہ سخاوی فرماتے ہیں "ضبط کی دو قسمیں ہیں ایک ضبط صدر، دوسر ضبط کتاب، ضبط صدر یہ ہے کہ راوی نے جو کچھ سنا ہے وہ سب اس کو اس طرح یاد ہو کہ جب چاہے اسے مستحضر کر سکے۔ اور ضبط کتاب یہ ہے کہ جو سنے اُسے فوراً لکھ لے تاکہ پھر اس میں کسی قسم کے خلل کے پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہے یہ ضبط کی اعلیٰ قسم ہے[2]۔ امام ترمذی، علل میں کہتے ہیں "جو شخص حدیث کے معاملہ میں متہم بالکذب ہو۔ اور مغفل ہو

[1] توجیہ النظر ص ۳۰ [2] مقدمۂ فتح الملہم ص ۱۵

اور خطا زیادہ کرتا ہو۔ اکثر ائمۂ حدیث کے نزدیک ایسے شخص کے لئے یہ بات طے شدہ ہے کہ کہ اس کی روایت پر دھیان نہ دیا جائے[1]

شذوذ حدیث صحیح کی تعریف میں تیسری شرط شذوذ سے خالی ہونے کی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ راوی نے جو حدیث روایت کی ہے اس میں کوئی ایسا شخص اس کے مخالف نہ ہو جو اس سے زیادہ قابل ترجیح ہو اور اس شذوذ کا تحقق اس وقت ہوگا۔ جبکہ دونوں روایتوں میں جمع کرنا مشکل ہو۔

علت رہ گئی علت تو اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی امر ایسا نہ پایا جائے جو صحت حدیث میں قادح ہو۔ مثلاً ارسال خفی یعنی راوی کا اپنے معاصر سے لفظ عن سے روایت کرنا جس سے یہ شبہ ہو کہ راوی نے اس سے سماع کیا ہے۔ حالانکہ اسے اپنے معاصر مروی عنہ سے بالکل سماع حاصل نہ ہو۔ یا تدلیس یعنی راوی روایت تو کرتا ہے اس شخص سے جس سے اس کو سماع حاصل ہے لیکن نقل وہ روایت کرتا ہے جو اس نے اس سے نہیں سنی اور اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ گویا اس نے اس روایت کو خود مروی عنہ سے سنا ہے۔ علت کی دو قسمیں ہیں خفیہ اور ظاہرہ خفیہ کی مثال اوپر گذر چکی ظاہرہ کی مثال فسق اور سوء حفظ وغیرہ[2] ہے۔

حسن حدیث کی دوسری قسم حسن ہے، اس کی تعریف عموماً یہ کی جاتی ہے کہ اس کا مخرج معلوم ہو اور رجال مشہور ہوں مخرج معلوم ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ حدیث ایسے راوی سے مروی ہو جو اپنے شہر کے لوگوں سے روایت کرنے میں شہرت رکھتا ہو مثلاً قتادہ اہل بصرہ سے روایت کرنے میں مشہور ہیں۔ پس اگر اہل بصرہ کی کوئی حدیث قتادہ سے مروی ہوگی تو کہا جائے گا کہ اس حدیث کا مخرج معلوم ہے۔ اس حدیث کے رواۃ بہ اعتبار ثقاہت

---

[1] مقدمہ فتح الملہم [2] شرح مقدمہ ابن صلاح ص ۸

صحیح کے رواۃ کے برابر نہیں ہوتے۔ چنانچہ علامہ ابن جوزی اس کی تعریف میں فرماتے ہیں اس حدیث میں کچھ ضعف ہوتا ہے جو احتمال کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن اس پر کسی عمل کی بنیاد رکھنا درست ہے۔ صحیح اور حسن یہ دونوں حدیثِ مقبول کی قسمیں ہیں۔

اس کے بالمقابل مردود کی تین قسمیں ہیں موضوع، متروک، منکر اور ضعیف کی جسمیں اسناد کے نقص کی وجہ سے ضعف ہوتا ہے چار قسمیں ہیں۔ منقطع معضل، معلق، مرسل، پھر رواۃ کی تعداد کے اعتبار سے حدیث کی دو قسمیں ہیں متواتر، اور خبرِ واحد، متواتر کی تعریف یہ ہے کہ اسکو ہر زمانہ میں اتنی کثیر جماعت نے نقل کیا ہو کہ ان سب کا جھوٹ بولنے پر متفق ہو جانا عادۃً محال ہو۔ جس حدیث میں تواتر کی شرطیں نہ پائی جائیں خبرِ واحد کہلاتی ہے۔ اور اسکی متعدد قسمیں ہیں۔

اسناد اور رواۃ کی تعداد اور صفات کے لحاظ سے حدیث کی اتنی قسمیں کرنا دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ محدثین نے حدیث کی صحت و سقم معلوم کرنے کے لئے اس کے ایک ایک جزء کا تجزیہ کیا، اسناد کے تمام رواۃ میں سے ایک ایک کو اچھی طرح جرح و تعدیل کی کسوٹی پر پرکھا اور الفاظ و معانی کے لحاظ سے بھی اس کے تمام پہلوؤں پر عمیق بصیرت کے ساتھ غور و خوض کیا۔ پھر ذرا ذرا سے فرق سے ایک حدیث کو دوسری حدیث سے ممتاز کرتے چلے گئے۔ اور اس طرح حدیث کی بہت ساری قسمیں ہو گئیں۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ محدثین کا جو کارنامہ انتہائی مدح و ستائش کا مستحق تھا۔ اور یہ سب اس لئے ہی تھا کہ صحیح حدیث غیر صحیح حدیث سے بالکل ممتاز ہو جائے۔ وہی منکرین حدیث کی نظر میں معیوب و مذموم قرار دیا جاتا ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں۔

انہوں (محدثین) نے احادیث پر جو احکام لگائے ہیں مثلاً قوی، صحیح، حسن، مقبول

یا ضعیف، منکر۔ موضوع۔ اور مردود۔ ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہونچ سکتے۔ ورنہ روایت کی صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ صحیح یا غلط،

سبحان اللہ!

خرد کا نام جنوں رکھدیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اِمام بخاریؒ

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صحت حدیث کے عام معیار کی حیثیت سے تھا۔ اب ہم ان محدثین کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے اپنی کتاب میں اس کا التزام کیا ہے کہ وہ اعلیٰ معیار کے مطابق جو حدیث صحیح ہوگی اسی کو نقل کریں گے اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام امام بخاری کا ہے۔

نام و نسب آپ کا نام محمد تھا اور کنیت ابو عبداللہ نسب یہ ہے محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرۃ بن بردزبہ۔ آپ کے اجداد فارس کے رہنے والے مجوسی تھے۔ سب سے پہلے جو شخص ان کے خاندان میں اسلام سے مشرف ہوئے مغیرۃ ہیں۔ بخارا کے رہنے والے تھے ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ امام بخاری کے والد ماجد اسماعیل بن ابراہیم بھی محدث تھے۔ امام ابھی کمسن ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ نے ماں کی آغوشِ کرم میں پرورش پائی۔

حفظ حدیث دس برس کی عمر ہوئی تو امام بخاری نے حدیث یاد کرنی شروع کی۔ آپ سے پہلے جو محدث تھے وہ اپنے اپنے شہروں کی احادیث جمع کرنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ امام مالک بن انسؒ نے حجاز اور خصوصاً اہل مدینہ کی احادیث جمع کیں۔ ابن جریج نے بھی اہل حجاز اور خصوصاً اہل مکہ کی ہی حدیثیں جمع کیں اس میں شبہ نہیں۔ امام بخاری سے پہلے بھی ایسے محدثین تھے جو دور دراز کی مسافتیں طے کر کے گوشہ گوشہ سے حدیث جمع کرتے تھے لیکن امام بخاری نے اس دائرہ کو اور زیادہ وسیع کر دیا تھا

طلب حدیث میں سفر چنانچہ امام نے اپنے شہر کی احادیث سننے کے بعد بلخ کا سفر کیا۔ اور

وہاں کے محدثین سے حدیثوں کی سماعت کی۔ پھر مرو، نیشاپور، رے، بغداد، بصرہ، کوفہ مکہ، مدینہ، مصر، دمشق، قیساریہ، عسقلان، حمص تشریف لیگئے اور ان جگہوں سے احادیث حاصل کیں۔

اس طویل سفر میں آپ نے سولہ برس صرف کئے اس مدت میں آپ نے جو کچھ محنت و مشقت برداشت کی ہوگی اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

تنقید حدیث | امام بخاری صرف حدیث سننے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ رواۃ اور الفاظ ومعانی کے اعتبار سے اس کی تنقید کرتے تھے۔ اور ایک ایک راوی کے حالات کی تحقیق کے لئے دور دراز ممالک کے کٹھن سفر اختیار کرتے تھے۔ پھر خدا کا بہت بڑا احسان ہے کہ امام بخاری کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ اور وہ احادیث صحیحہ کو احادیث غیر صحیحہ سے متمیز کرنے میں بخوبی کامیاب ہو گئے، امام ہمام کی یہ کامیابی دو وصفوں کی رہین منت ہے۔

آپ کا پہلا وصف غیر معمولی قوت حافظہ ہے وہ خود فرماتے ہیں "مجھ کو ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں اور صحابہ و تابعین جن کی میں نے حدیث لی ہے ان میں کوئی ایسا نہیں ہے کہ مجھ کو اُن کی تاریخ اور جائے پیدائش و وفات اور وطن معلوم نہ ہو اور میں جب کسی صحابی یا تابعی کی کوئی حدیث روایت کرتا ہوں میرے پاس اس کی اصل موجود ہوتی ہے"[1] پھر اس غیر معمولی قوت حافظہ کے ساتھ امام بخاری احادیث لکھکر انہیں اور زیادہ محفوظ کر دیتے تھے۔ اور صرف لکھنے پر ہی کفایت نہیں کرتے تھے بلکہ رات کے وسط میں بیدار ہو کر ان کا مطالعہ کرتے۔ اور ان میں غور وخوض کرتے تھے۔

دوسری چیز جو امام بخاری کی مابہ الامتیاز ہے وہ ان کی غیر معمولی مہارت تنقید رجال ہے

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۲۴

وہ خود فرماتے ہیں "تاریخ میں کوئی ایسا نام نہیں ہے، جس کے متعلق مجھ کو کوئی قصہ معلوم نہ ہو"۔ ایک مرتبہ ان کے سامنے ایک حدیث بیان کی گئی جس کے ایک راوی کا نام عطار الکیخارانی تھا کسی نے پوچھا "کیخاران کس جگہ کا نام ہے"؟ فرمایا "یمن کے ایک گاؤں کا نام ہے حضرت معاویہ نے ان کو صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ یمن بھیجا تھا۔ وہاں عطار نے ان سے یہ دو حدیثیں سنی تھیں[1]

امام بخاری ان دو وصفوں میں سب سے ممتاز ہونے کے باعث اپنے عہد کے تمام بڑے بڑے محدثین سے اعلیٰ و افضل سمجھے جاتے تھے اور یہ حضرات بھی حدیث کے معاملہ میں امام کے فیصلہ کو ناطق قرار دیتے تھے۔ اسماعیل بن ابی اویس ایک محدث تھے۔ امام بخاری نے ان کے مجموعۂ احادیث سے چند حدیثیں منتخب کرکے الگ کرلیں تو انہوں نے ان کو اپنے لئے الگ لکھ لیا۔ اور پھر از راہ فخر کہا کرتے تھے۔ "یہ وہ حدیثیں ہیں جو محمد بن اسماعیل نے میرے مجموعۂ احادیث سے منتخب کرلی ہیں[2]، حجاز، کوفہ، بصرہ، بغداد، شام اور مصر و خراسان ان میں کوئی مقام ایسا نہیں تھا جہاں کے علماء و فضلاء امام عالی مقام کی فضیلت و برتری کے سامنے سر تسلیم خم اور ان کی بارگاہ علم و کمال میں عقیدت و ارادت کا خراج پیش نہ کرتے ہوں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ

تاریخ میں آپ نے التاریخ الکبیر، التاریخ الاوسط۔ اور التاریخ الصغیر کے نام سے جو کتابیں تصنیف کی ہیں۔ آپ کی مہارت و امامت فن کی شاہد عدل ہیں، ان کے علاوہ ضعیف راویوں کے حالات میں۔ اور علل پر مستقل کتابیں کتاب الضعفاء اور کتاب العلل کے نام سے تصنیف کیں۔ کنیتوں پر آپ کی ایک مستقل کتاب کتاب الکنی کے نام سے ہے، ان کے ماسوا الادب المفرد الجامع، الکبیر اور المسند الکبیر بھی آپ کی مشہور تصنیفات ہیں[3]

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی ج ۲ ص ۸ [2] خطیب بغدادی ج ۲ ص ۹ [3] مقدمۂ فتح الباری ص ۴۰۲

الجامع الصحیح آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جس کے احسان سے دنیائے اسلام کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی، آپ کی کتاب الجامع الصحیح ہے۔ امام بخاری نے سولہ برس کی محنت شاقہ میں ملک ملک کی خاک چھان کر گوشہ گوشہ سے احادیث صحیحہ کے جو انمول جواہر ریزے فراہم کئے تھے۔ ان میں سے بھی بکمال تحقیق وتدقیق بالکل صحیح احادیث کا انتخاب اپنی صحیح میں جمع کر دیا۔ جس کو بجا طور پر اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔

بعض محدثین نے بخاری کی کسی کسی حدیث پر کلام کیا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کو تمام کتب حدیث سے زیادہ صحیح اور مستند مانا گیا ہے۔ ابو جعفر کہتے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی کتاب ابن مدینی، امام احمد بن حنبل۔ اور یحیی بن معین (جن کی جلالت شان اور ثقاہت وعدالت میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا) کے سامنے پیش کی تو سب نے متفق ہو کر اس کی صحت کی شہادت دی البتہ صرف چار حدیثیں ایسی تھیں جن کو محل نظر وتامل قرار دیا گیا عقیلی کہتے ہیں ان چار حدیثوں میں بھی قول امام بخاری کا ہی صحیح ہے۔ حاکم ابو احمدؒ کہتے ہیں۔

محمد بن اسماعیل الامام	محمد بن اسماعیل الامام سب سے پہلے بزرگ ہیں
فانہ الذی الف الاصول	جنہوں نے اصول مرتب کئے اور انکو لوگوں کے سامنے
وبین للناس وکل من عمل	بوضاحت بیان کیا۔ جس کسی شخص نے ان کے
بعدہ فانما اخذہ من کتابہ[۲]	بعد کوئی کام کیا ہے اس نے انکی ہی کتاب سے لیا ہے

امام بخاری کی طرح امام مسلم کا مرتبہ بھی احادیث صحیحہ کے التزام وتنقید میں بہت بلند ہے۔ لیکن مشہور محدث ابو الحسن الدار قطنی فرماتے ہیں۔ اگر بخاری نہ ہوتے تو مسلم کیلئے ترتیب کتاب کی راہ ہموار نہ ہوتی" پھر فرماتے ہیں" امام مسلم نے بخاری کی کتاب کو ہی اپنے لئے اسوہ بنایا ہے۔ اور اسمیں

---

[۱] مقدمہ فتح الباری ص ۲۰۳ [۲] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۲۰۳

اور احادیث کا اضافہ کر دیا ہے[1]۔ تاہم حسن ترتیب اور طرق اسناد کی جامعیت کے لحاظ سے مسلم کا جو مقام ہے اسکی تفصیل امام مسلم کے حالات میں آگے آئیگی۔

تعداد احادیث | حافظ ابن حجر کے قول کے مطابق صحیح بخاری کی کل احادیث ۷۳۹۷ سات ہزار تین سو ستانوے ہیں۔ لیکن ان میں مکرر احادیث بھی شامل ہیں، البتہ معلقات، متابعات موقوفات۔ اور مقطوعات داخل نہیں ہیں۔ اگر تعلیقات اور متابعات کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر یہ تعداد ۹۰۸۲ تک پہونچ جاتی ہے۔ مکررات کو الگ کرنے کے بعد اگر صرف احادیث متصلۃ السند کا شمار کیا جائے تو یہ تعداد گھٹ کر ۲۷۶۲ ہی رہجاتی ہے۔ خود امام بخاری کا ایک بیان ہے کہ۔ "مجھ کو ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح احادیث یاد ہیں[2]" اس کے باوجود ان کا اپنی صحیح میں صرف دو ہزار سات سو باسٹھ احادیث کا جمع کرنا۔ جس طرح ان کی غایت تحقیق و تنقید کی دلیل ہے اس بات کا بھی بیّن ثبوت ہے کہ یہ سب حدیثیں زر خالص ہیں۔ اور ہم ان کو بے چون و چرا تسلیم کر سکتے ہیں۔

شروط بخاری | اور حقیقت بھی یہی ہے۔ امام بخاری نے حدیث لانے کی جو مخصوص شرطیں متعین کی ہیں ان کے پورا ہو جانے کے بعد پھر کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی امام خلد مقام کی پہلی شرط جس میں اُن کے ساتھ امام مسلم بھی شریک ہیں۔ یہ ہے کہ حدیث کی اسناد متصل ہونی چاہیئے۔ یعنی امام بخاری نے اس کو جس راوی سے سنا ہے۔ اس سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کا سلسلہ برابر مربوط ہونا چاہیئے۔ یہ نہ ہو کہ درمیان میں کہیں انقطاع پیدا ہو جائے۔ پھر اس روایت کے جتنے راوی ہیں ان سب کے لئے مسلمان صادق، غیر مدلّس و غیر مختلط عدالت و ثقاہت کی تمام صفات کے ساتھ متصف، ضابط، اور متحفظ، سلیم الذہن، قلیل الوہم اور صحیح الاعتقاد ہونا ضروری ہے۔ پھر جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ امام بخاری

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۲۰۳ [2] تذکرۃ الحفاظ للذہبی تذکرۂ امام بخاری

حدیث کے ہر بڑے امام مثلاً امام زہری و نافع کے تلامذہ کو صحبتِ شیخ کی مدت و ملازمت اور حفظ و اتقان کے اعتبار سے چند طبقات پر تقسیم کرتے ہیں، یعنی ایک وہ جنہوں نے سفر و حضر میں شیخ کے ساتھ معیت و مصاحبت رکھی ہے اور پھر وہ حفظ و اتقان میں بھی سب سے نمایاں ہیں۔ دوسرے وہ جو حفظ و اتقان میں تو ایسے ہی مشہور ہیں لیکن ان کو شیخ کی صحبت زیادہ میسر نہ ہو سکی وعلی ہذا۔ ان مختلف درجات کے محدثین میں سے امام بخاری کی شرط یہ ہے کہ راوی درجۂ اول میں سے ہونا چاہیئے۔ درجۂ دوم کے راوی کی روایت بھی وہ لے لیتے ہیں لیکن اصل کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض تعلیقاً۔

امام بخاری کی دوسری شرط یہ ہے کہ وہ روایت معنعن کو قبول نہیں کرتے یعنی اگر کوئی راوی اپنے کسی ہمعصر سے روایت کرتا ہے تو امام بخاری کے نزدیک محض ہمعصر ہونا کافی نہیں ہے۔ بلکہ جب تک دونوں کی ملاقات ثابت نہیں ہوگی وہ حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔ امام مسلم اس شرط کے خلاف ہیں ان کے نزدیک معاصرت بھی قبولِ حدیث کے لئے کافی ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ روایت معنعنہ کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور اکثر محدثین کا میلان خاطر بھی اسی طرف ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک لفظ عن کا استعمال "قال" کی طرح مطلق اجازت اور اتصال کے لئے ہوتا رہا ہے اس لئے جبتک ارسال کا کوئی قوی قرینہ نہ ہو محض عن کی وجہ سے ارسال خفی کے شبہ پر روایت کو ترک کر دینا صحیح نہ ہوگا۔" تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو۔ امام بخاری کا روایت عنعنہ کو قبول نہ کرنا ان کے کمال احتیاط و اتقان کی دلیل ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام بخاری سے ایک حدیث کے متعلق سوال کیا جس میں تدلیس کا گمان ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا "تم کو خیال ہوتا ہے کہ میں تدلیس کرتا ہوں

حالانکہ میں نے اسی تدلیس کے شبہ پر ایک شخص کی دس ہزار بلکہ اس سے زائد حدیثیں ترک کردی ہیں"

امام مسلم امام بخاری کے بعد دوسرا مرتبہ امام مسلم کا ہے۔ آپ عربی الاصل تھے۔ قبیلۂ قشیر سے تعلق رکھتے تھے، نام مسلم تھا اور کنیت ابو الحسین، نیشاپور آبائی وطن تھا۔ ۲۰۴ھ یا ۲۰۶ھ میں پیدا ہوئے۔ طلب حدیث میں، عراق، حجاز، شام اور مصر کا سفر کیا۔ بغداد بھی کئی مرتبہ تشریف لے گئے اور وہاں حدیث کا درس دیا۔ جس زمانہ میں امام بخاری نیشاپور میں مقیم تھے امام مسلم نے ان سے بھی استفادہ کیا۔ ۲۶۱ھ میں بمقام نیشاپور وفات پائی۔ امام مسلم کی ہمہ گیر مہارت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے حدیث اور متعلقات حدیث پر کثرت سے کتابیں تصنیف کیں جن کے نام یہ ہیں۔

المسند الکبیر علی الرجال۔ کتاب الجامع علی الابواب۔ کتاب الاسماء والکنی کتاب التمییز۔ کتاب العلل۔ کتاب الوحدان۔ کتاب الافراد۔ کتاب الاقران۔ کتاب سوالاتہ۔ احمد بن حنبل۔ کتاب حدیث عمرو بن شعیب۔ کتاب مشائخ۔ مالک کتاب مشائخ الثوری، کتاب مشائخ شعبہ۔ کتاب من لیس لہ۔ الا واحد کتاب المخضرمین۔ کتاب اولاد الصحابۃ۔ کتاب اوہام المحدثین، کتاب الطبقات کتاب افراد الشامیین۔ اور کتاب روایۃ الاعتبار[1] لیکن ان کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ صحیح مسلم ہے۔ جس میں انہوں نے غایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ اپنی شرط کے مطابق منتخب احادیث صحیحہ جمع کردی ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ مکرر احادیث سمیت کل احادیث کی تعداد ۷۲۷۵ اور مکررات کے علاوہ تقریباً چار ہزار حدیثیں ہیں۔

---

[1] مقدمۂ فتح الملہم

صحیح بخاری و صحیح مسلم کا موازنہ امام مسلم کی جلالت شان اور بزرگی و برتری میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موازنہ و مفاضلہ کے وقت جمہور کا فیصلہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر افضلیت ہے۔ اور اس کے وجوہ یہ ہیں۔

(۱) رجالِ مسلم میں سے جن لوگوں کو ضعیف کہا گیا ہے ان کی تعداد بہ نسبت ان رجالِ بخاری کے جن کی تضعیف کی گئی ہے زیادہ ہے، بخاری کے کل ایسے راوی ۸۰ ہیں اور مسلم کے ۱۶۰ جن سے صرف امام مسلم نے روایت کی ہے

(۲) امام بخاری ایسے ضعیف لوگوں کی روایتیں زیادہ نہیں لیتے صرف ایک دو حدیثیں لے لیتے ہیں۔ امام مسلم نے ایسے لوگوں کی حدیثیں زیادہ تعداد میں لی ہیں۔

(۳) امام بخاری صرف درجۂ اول (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کے رواۃ کی حدیثیں لیتے ہیں شاذ و نادر کہیں تعلیقاً درجۂ دوم کے رواۃ کی حدیثیں بھی نقل کر دیتے ہیں

(۴) امام بخاری روایت معنعن پر اس وقت تک متصل السند روایت کا حکم نہیں لگاتے جب تک کہ معنعن اور معنعن عنہ کی ملاقات تاریخی اعتبار سے ثابت نہ ہو۔ اس کے برخلاف امام مسلم روایت معنعن پر بھی اتصال کا حکم لگا دیتے ہیں۔ اگر راوی مدلس نہ ہو۔

یہ وجوہ ہیں جن کے باعث صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ بعض وجوہ سے صحیح مسلم کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے ان میں ایک بڑی وجہ جیسا کہ حافظ ابن حجر اور بعض دوسرے علماء نے لکھی ہے یہ ہے کہ امام مسلم نے ایک حدیث کے جتنے طرق و اسانید انہیں معلوم تھے سب ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں جس سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب حدیث کو بیک وقت ایک حدیث کے تمام طُرق معلوم ہو جاتے ہیں اور پھر اسکے لئے حدیث پر حکم لگانا سہل ہو جاتا ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگرچہ امام مسلم نے بھی امام بخاری کی طرح اپنی کتاب کو ابواب فقہیہ پر مرتب کیا ہے۔ لیکن انہوں نے خود کسی مسئلہ پر حکم لگانے سے اجتناب کیا اور اس باب کے ماتحت صرف احادیث کے جمع کر دینے پر کفایت کی ہے۔

انتقاد بخاری و مسلم یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ بعض محدثین نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی بعض حدیثوں پر جو کلام کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حدیثیں بالکل ساقط ہیں بلکہ وہ صرف ایک فنی کلام ہے۔ امام بخاری و مسلم نے اپنی تحقیق میں بعض راویوں کو عدول اور ثقہ سمجھا۔ اور ان کی روایت قبول کر لی اب بعض محدثین مثلاً دارقطنی اور ابن جوزی وغیرہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ متکلم فیہ ہیں۔ تو ہم کو ان دونوں میں محاکمہ کرنا ہوگا۔ اور چونکہ اکثریت امام بخاری کی طرف ہے اور ان کی غایت تحقیق و تدقیق مسلم ہے اس لئے فیصلہ انہیں کے حق میں ہونا چاہیئے، اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ یہ چند حدیثیں ضعیف ہیں تو ان کے علاوہ وہ تمام احادیث جن کی صحت پر امت کا اتفاق ہے انہیں تو صحیح تسلیم کرنا ضروری ہے۔ تضعیف حدیث میں اگر ناقدین کا قول صحیح ہو سکتا ہے۔ تو تصحیح کے باب میں بھی ان کا قول معتبر ہوگا۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ ان کے ایک قول کو تسلیم کریں اور دوسرے کو رد کر دیں افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔

حافظ ابن حجرؒ بخاری و مسلم کے ناقدوں کی تنقید پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"ہر مصنف کو یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ اگرچہ ان میں سے اکثر احادیث اصل موضوع کتاب میں کوئی قدح پیدا نہیں کرتیں۔ کیونکہ جیسا کہ امام ابو عمرو بن الصلاح وغیرہ نے دعوٰی کیا ہے کہ اس کتاب کی تمام احادیث باجماع صحیح ہیں۔ تاہم زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ یہ چند مواضع وہ ہیں جن کی صحت میں نزاع ہے اور

ان کو وہ تلقی بالقبول حاصل نہیں ہوئی جو کتاب کے بڑے حصہ کو حاصل ہے[1]

حافظ ابن تیمیہؒ منہاج السنہ میں فرماتے ہیں

"تصحیح کے باب میں ائمہ حدیث نے بخاری و مسلم کی تقلید نہیں کی ہے بلکہ جن حدیثوں کی تصحیح ان دونوں اماموں نے کی ہے وہ سب کی سب تقریباً بیس حدیثوں کو مستثنیٰ کرکے امام بخاری و مسلم سے پہلے بھی صحیح تھیں۔ ان کے عہد میں بھی صحیح تھیں اور ان کے بعد بھی صحیح رہیں۔ ائمہ فن نے ان دونوں کتابوں میں بہت غور و خوض کیا اور پھر تصحیح احادیث میں امام بخاری و مسلم سے موافقت کی[2]"

---

[1] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۸۱ [2] امام بخاری و امام مسلم کے علاوہ چار ائمہ حدیث اور ہیں جن کے مجموعہائے احادیث کو صحاح قرار دیا گیا ہے۔ امام ابوداؤد۔ ترمذی، نسائی اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ۔ ان سب بزرگوں کے تراجم باعث طوالت ہوتے اور پھر ان چار کتابوں کا مرتبہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کے بعد ہے منکرین حدیث بخاری و مسلم کو ہی مان لیں تو بسا غنیمت ہے۔ اس سبب سے ان بزرگوں کے تراجم ترک کرتا ہوں۔

اصولِ درایت

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اصول روایت کی نسبت تھا۔ اب ہم تحقیق روایات و واقعات کے دوسرے اصول درایت پر کلام کرتے ہیں جو پہلے اصول روایت کی طرح بڑا اہم اصول ہے۔

جس طرح روایت کا اصول قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ اصولِ درایت بھی قرآن مجید نے ہی متعین کر دیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بعض منافقوں نے تہمت لگائی۔ اور اس کا چرچا اس زور و شور سے کیا کہ بعض مسلمان بھی مذبذب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ	اور جب تم نے اس خبر کو سنا تو یہ کیوں
لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا	نہیں کہدیا کہ ہمیں ایسی بات کبھی مناسب
بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ	نہیں ہے سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس خبر بے بنیاد کو سننے کے بعد تمہیں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہیئے تھا کیونکہ یہ انتہائی نامعقول بات ہونے کے باعث درایتہً بالکل ساقط الاعتبار تھی۔

درایت کی ابتدا عہد صحابہ میں | درایت کی ابتدا خود صحابۂ کرام کے عہد میں ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایک حدیث بیان کی جس کا حاصل یہ تھا "آگ سے پکی ہوئی چیز کے کھانے پر وضو کرنا چاہیئے"۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سنا تو کہا "اگر یہ صحیح ہے تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جانا چاہیئے"۔[1]

---

[1] صحیح ترمذی باب الوضوء

حضرت ابن عباسؓ حضرت ابوہریرہؓ کو ضعیف الروایہ نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ انکی یہ روایت درایت کے خلاف تھی۔ اس لئے انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اور یہ سمجھے کہ حضرت ابوہریرہ کو سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے۔ درایت کے اصول میں ایک یہ بھی ہے کہ جو روایت کتاب اللہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مشہور سنت کے خلاف ہو اسے قبول نہ کرنا چاہیئے۔ صحابہ کرامؓ کا اس پر بھی تعامل تھا۔ اور وہ ایسی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک عورت نے کوئی حدیث بیان کی۔ آپ نے اس کے تسلیم کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم ایک عورت کے کہنے پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ایک حدیث ہے کہ میت کو اس کے پسماندگان کے نوحہ کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث سنی تو اسکو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ یہ قرآن مجید کے حکم لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی اور وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے خلاف ہے۔ اسی طرح حدیث معراج میں جو یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رویت باری سے مشرف ہوئے۔ تو حضرت عائشہؓ نے اس کی صحت سے بھی انکار کر دیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ۔

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اُسے دھو لینا چاہیئے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے یہ سنا تو فرمایا "اچھا پھر برتن کا کیا ہوگا؟" ان دونوں بزرگوں کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہاتھ کو دھوئے بغیر پانی میں ڈالدینے سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔ تو اس کی وجہ سے برتن (مٹکا اس) بھی ناپاک ہو جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں بڑا حرج ہے پس ایسا حکم ایک اصل رفع الحرج کے خلاف ہے اور اس لئے اس کی صحت پر اعتبار کرنا مشکل ہے۔

اس سے بھی زیادہ حقیقت افروز ایک اور واقعہ ہے، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے سامنے

بدفالی کے متعلق حضرت ابن عمرؓ کی حدیث نقل کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کبھی کبھی اقوالِ جاہلیت بیان فرماتے تھے۔ یعنی ان کی حیثیت محض حکایت کی ہوتی تھی چنانچہ بدفالی کے متعلق بھی ایسا ہی ہے آپ خود یہ حکم کس طرح بیان کر سکتے تھے۔ جبکہ قرآن مجید میں صاف طور پر فرمادیا گیا ہے اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ (تمام حکم اللہ تعالےٰ کیلئے ہی ہے[1])

درایت کے اصول | تدوین حدیث کا دور آیا اور اس کی صحت وغیرہ کے اصول وضوابط متعین کئے گئے تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے۔ علامہ سمعانی فرماتے ہیں

"صحیح کی پہچان صرف یہی نہیں ہے کہ اس کو ثقہ راویوں نے بیان کیا ہو بلکہ فہم معرفت اور کثرتِ سماع اور مذاکرہ سے بھی اس کو پہچانا جاتا ہے"

شیخ ابو اسحاق الشیرازی لمعہ میں لکھتے ہیں۔

"وہ امور جن کی وجہ سے اگر کسی خبر کو ثقہ نے بھی بیان کیا ہو تب بھی اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ یہ ہیں۔

۱۔ جو روایت مقتضیاتِ عقل کے خلاف ہو اس کا باطل ہونا معلوم ہے کیونکہ شرع تو مجوزات عقل کے مطابق ہے نہ کہ اس کے خلاف۔

۲۔ کتاب اللہ کی کسی نص، یا سنت متواترہ کے خلاف ہو تو سمجھا جائے گا کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے یا وہ منسوخ ہے۔

۳۔ اجماع کے خلاف ہو۔

۴۔ ایک ہی شخص تنہا کوئی ایسی روایت بیان کرے جس کا علم تمام لوگوں کو ہونا ضروری ہو۔

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھو الموافقات للشاطبی ج ۳ ص ۱۹، ۲۰

۵ - راوی تنہا ایسی روایت بیان کرے جس کو عادۃً اہلِ تواتر کے ذریعہ مروی ہونا چاہیئے۔

فتح المغیث میں ہے کہ حدیث کا موضوع ہونا کبھی الفاظ کی عدم فصاحت سے بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب والعجم تھے۔[1]

علامہ ابن جوزی نے انہیں اصول درایت کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

قال ابن جوزی وکل حدیث	ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو
رأیتہ یخالف العقول او	کہ عقل یا اصول کے خلاف ہے تو جان لو
ینافض الاصول فاعلم انہ	کہ وہ من گھڑت ہے۔ اس کی نسبت اس
موضوع فلا یتکلف اعتبارہ	بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر
ای لا تعتبر رواتہ ولا تنظر فی	ہیں یا غیر معتبر۔ اسی طرح وہ حدیث قابل
جرحہم او یکون مما یدفعہ الحس	اعتبار نہیں ہے جو حس اور مشاہدہ کے
والمشاہدۃ او مبائنا لنص الکتاب	خلاف ہو اور وہ حدیث بھی غیر معتبر ہے
والسنۃ المتواترۃ او الاجماع	جو نص کتاب سنت متواترہ یا اجماع قطعی
القطعی حیث لا یقبل شیئا من	کے خلاف ہو اور پھر کسی قسم کی تاویل کی اس
ذلک التاویل او یتضمن الافراط	میں گنجائش بھی نہ ہو۔ یا وہ حدیث جس
بالوعید الشدید علی الامر	میں ایک ذرا سی بات پر سخت وعید دی گئی
الیسیر او بالوعد العظیم علی	ہو یا اس کے برعکس معمولی سے فعل پر بہت
الفعل الیسیر وھذا الاخیر کثیر	بڑے ثواب کا وعدہ کیا گیا ہو اس قسم کی حدیثیں

[1] یہ معلومات مقدمہ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ص ۱۶ سے ماخوذ ہیں۔

موجود فی حدیث القصاص والطرقیة ومن رکّة المعنی لا ناکلوا لقرعة حتی تذبحوها ولذا جعل بعضهم ذالك دلیلا علی کذب راویه وکل هذا من القرائن فی المروی وقد تکون فی الراوی کقصة غیاث مع المهدی او انفراده عمن لم یدرك بما لم یوجد عند غیرهما او انفراده بشیء مع کونه مما یلزم المکلفین علمه وقطع العذر فیه کما قرره الخطیب فی اول الکفایة او بامر جسیم یتوفر الدواعی علی نقله کحصر العدو الحاج عن البیت[1]

. . . .

قصہ گو اور بازاری لوگوں کے کلام میں کثرت سے موجود ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ حدیث بھی ناقابل اعتبار ہے جس میں لغویت پائی جائے مثلاً یہ کہ کدو بغیر ذبح نہ کھاؤ۔ اسی کو دیکھ کر بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا راوی کاذب ہے یہ تمام قرینے تو وہ ہیں جو روایت میں پائے جاتے ہیں کبھی یہ قرائن راوی میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ پیش آیا۔ جبکہ کوئی راوی تنہا ایسے شخص سے روایت کرے جس سے ملا بھی نہ ہو، یا تنہا کوئی ایسی بات بیان کرے جس کا علم اور لوگوں کو بھی ہونا ضرور تھا۔ جیسا کہ خطیب نے کفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے یا وہ واقعہ اتنا اہم ہو کہ اس کے نقل کے اسباب وافر ہوں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے لوگوں کو حج کرنے سے روک دیا۔

بقول علامہ شبلی نعمانی اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت

[1] فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱۴۔ اصل کتاب میرے سامنے نہیں ہے۔ میں نے یہ عبارت مقدمہ سیرت النبی ص ۳۹، ۴۰ سے لی ہے۔

اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں؛-

(۱) جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

(۲) جو روایت اصول مسئلہ کے خلاف ہو۔

(۳) محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

(۴) قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

(۵) جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

(۶) معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

(۷) وہ روایت رکیک المعنیٰ ہو۔ مثلاً کدو کو بغیر ذبح نہ کھاؤ۔

(۸) جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی۔ اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

(۹) جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو یا اینہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

(۱۰) جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں راوی اس کو بیان کرتے۔ اس کے باوجود صرف ایک ہی راوی نے اس کو بیان کیا ہے

ملا علی قاری نے موضوعات کے خاتمہ پر حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں[۱]۔

---

[۱] یہ پورا خلاصہ مقدمۂ سیرت النبی سے ماخوذ ہے

(۱) جس حدیث میں ایسی فضول باتیں ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکل سکتیں مثلاً یہ کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے جس کی ستر زبانیں ہوتی ہیں اور ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں۔

(۲) وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔

(۳) جو حدیث صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

(۴) جو حدیث واقع کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیئے کہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔ (اگرچہ تجربہ کی رو سے یہ مضمون درست ہے)

(۵) جو حدیث انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں۔ سبزہ زار آب رواں اور خوبصورت چہرہ کا دیکھنا۔

(۶) وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیش گوئی بقید تاریخ مذکور ہو مثلاً یہ کہ فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔

(۷) وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے زیادہ مشابہ ہوں۔ مثلاً یہ کہ ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے۔ یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔

(۸) وہ حدیثیں جن کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں۔ مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز تھا۔

(۹) وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو۔ مثلاً یہ کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہوگی۔ اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کب آئے گی حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔

(۱۰) بعض وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

(۱۱) جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

(۱۲) بعض وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں۔

صاحب کشف الاسرار نے بھی قریب قریب یہی لکھا ہے۔

خبر واحد اگر مقتضیٰ عقل کے خلاف ہو تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ اس میں بغیر کسی تکلفِ بارد کے تاویل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر تاویل صحیح ہو سکے تو اس خبر کو قبول کر لینا چاہیئے۔ ورنہ اسے رد کر دینا چاہیئے۔ اسی طرح خبر بعض کتاب سنت متواترہ۔ یا اجماع کے خلاف ہو تو اسے بھی رد کر دینا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ تمام دلیلیں قطعی ہیں۔ اور خبر واحد ظنی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قطعی اور ظنی میں کوئی تعارض نہیں ہوتا۔ بلکہ قطعی کے مقابلہ میں ظنی ساقط ہو جاتا ہے[1]"

ان اصول کی بناء پر ہر زمانہ میں روایات پر تنقید کی گئی ہے۔ حافظ ابن حجر روایت معراج کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ثابت کی روایت میں جو فَرَبَطْتُهُ بِالْحَلْقَةِ۔ میں نے براق کو حلقہ سے باندھ دیا آیا ہے تو حضرت حذیفہ اس کی صحت سے انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کیا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے براق کو اس لئے باندھ دیا تھا کہ اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا؟ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ اللہ نے اسوقت آپ کیلئے عالم غیب و شہادت کو مسخر کر دیا تھا۔

اسماعیلی بخاری کی روایت جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے والد آزر سے قیامت کے دن اس حال میں ملیں گے کہ آزر کے چہرہ پر تارکول ملا ہوا ہوگا۔ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس خبر کی صحت میں نظر ہے اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس جب اللہ تعالیٰ اُن سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ قیامت کے

---

[1] مقدمہ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ص ۱۸

دن اُن کے باپ آذر کو رسوا نہیں کرے گا۔ تو پھر اس کے خلاف کس طرح کر سکتا ہے "۔ حافظ ابن حجر حدیث ابی ہریرہؓ

خلق اللہ آدم وطولہ ستون ذراعًا — اللہ نے حضرت آدم کو پیدا کیا اور ان کا طول ساٹھ گز تھا۔

کے متعلق کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "امم گذشتہ کے جو آثار ثمود کے دیار کی طرح مٹے ہوئے پائے جاتے ہیں انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد و قامت ترتیب سابق کے اقتضاء کے مطابق بہت زیادہ طویل نہیں تھے۔ حالانکہ ان کا زمانہ بھی بہت قدیم ہے۔ اور جو زمانہ قوم ثمود اور حضرت آدم کے درمیان ہے وہ اس زمانہ سے کم ہے جو قوم ثمود اور امتِ مسلمہ کے شروع زمانہ کے درمیان ہے۔ اب تک مجھ کو اس اشکال کا حل معلوم نہیں ہوا[1]"

اس تقریر سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ محدثین نے تحقیق کے دونوں اصول روایت اور درایت دونوں کی تعیین و تشخیص میں اور ان پر عمل کرنے میں یکساں اہتمام کیا۔ اور تنقید روایات میں دونوں سے کام لیا ہے۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ بعض خاص خاص محدثین دار قطنی وغیرہ نے اسناد پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور حدیث کے متن کی طرف اتنا اعتنا نہیں کیا۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محدثین یہ سمجھتے تھے کہ اصولِ درایت ہر شخص کو معلوم ہو سکتے ہیں جو قرآن اور اجماع سے واقف ہو اور عقل سلیم رکھتا ہو۔ صرف ایک اسناد کا فن ہی ایسا دقیق اور مشکل ہے کہ محدثین کے سوا دوسروں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔

اب روایت اور درایت کے ان اصولوں کو اور محدثین نے ان کی تحقیق و تاکید میں جو کوشش کی ہیں ان سب پر غور کرو اور بتاؤ کیا کسی روایت کی توثیق و تصدیق کے لئے اس سے بلند کوئی

---

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۲۸۲ طبع جدید

اور معیار ہو سکتا ہے؟ کیا دنیا کی تاریخ میں کوئی ایک قوم بھی ایسی ہے جس نے اسناد اور متن کے ہر ممکن سے ممکن پہلو کو سامنے رکھکر اس کی چھان بین میں انسانی کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ہو؟ اسناد میں عقلی اعتبار سے جتنے احتمالات ہو سکتے ہیں ان سب پر ان بزرگوں نے مبصرانہ نگاہ ڈالی اور احتیاط کا یہ عالم کہ جہاں کذب کا ذرا سا شائبہ بھی نظر آیا اسے فوراً ترک کر دیا۔ اسی طرح متن حدیث کی صحت معلوم کرنے کی غرض سے محدثین نے درایت کے اصول متعین کئے۔ لفظ۔ معنی۔ عبارت اور طرز بیان ہر ہر لحاظ سے اس کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا۔ صحیح ضعیف اور موضوع، ان کے الگ الگ خصائص بیان کئے، ان کے اوصاف تعین کئے۔ اور تمام ذخیرہائے حدیث کو کنگھال کر ہر ہر حدیث پر حکم لگایا۔ اور ایک نوع کو دوسرے سے الگ کر دیا۔

امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، اور ابن ماجہ رحمہم اللہ اجمعین نے جس طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر صحیح احادیث جمع کیں اور ان کو مرتب کر کے شائع کیا۔ اسی[1] طرح بعض محدثین نے موضوع حدیثوں کو جمع کیا اور ان کو کتاب کی شکل میں ترتیب دیا۔ تاکہ بحکم وبضدها تتبین الاشیاء رات کو دیکھ کر لوگوں کو دن کی پہچان ہو جائے۔ پھر رواۃ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں ایک ایک راوی حدیث کے حالات بکمال دقیق النظری تحقیق و تفتیش کرنے کے بعد لکھے گئے۔ یہاں تک کہ اب ایک راوی بھی ایسا نہیں ہے جس پر محدثین نے کلام نہ کیا ہو۔ پھر جو ثقہ راوی تھے ان پر الگ اور جو ضعیف تھے ان پر الگ اور جو مدلس یا وضاعین وکذابین تھے ان پر الگ ضخیم ضخیم کتابیں لکھیں۔ سب کے چہروں سے نقاب اٹھا کر اصل حقیقت کو بے حجاب کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ایک دوسرے سے اس طرح متمیز کر دیا کہ آج صاحب چشم بصیرت بے تکلف دونوں میں خط امتیاز کھینچ سکتا ہے۔ علامہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب تاویل مختلف الحدیث کے شروع میں متکلمین کے وہ اعتراضات نقل کئے ہیں

[1] صفحہ ۱۷۵ دیکھیئے

جو وہ محدثین پر کرتے ہیں۔ محدثین کی طرف سے ان اعتراضات کا جواب دینے کے بعد لکھتے ہیں

اصحاب حدیث نے حق اس کی اپنی جگہ سے طلب کرنا چاہا ہے۔ اور ان کی خواہش یہ رہی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن کا اتباع کرکے اللہ کا تقرب حاصل کریں۔ محدثین سنن معلوم کرنے کے بعد برابر ان کی تحقیق وتفتیش اور چھان بین میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ان کے صحیح اور سقیم میں، ناسخ اور منسوخ میں پوری بصیرت کے ساتھ امتیاز کرلیا۔ اور فقہاء میں سے جو ارباب رائے سنن کے خلاف تھے ان کو بھی انہوں نے پہچان لیا اور لوگوں کو اس پر متنبہ کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق ظاہر ہوگیا جبکہ وہ مٹنے کے قریب تھا اور وہ لہلہانے لگا۔ جبکہ اس پر پژمردگی کا غلبہ ہوچلا تھا۔ اور سنن کے وہ لوگ بھی مطیع ہوگئے جو ان سے انحراف کرتے تھے اور جو پہلے ان سے غفلت برتتے تھے۔ ان میں اب بیداری پیدا ہوگئی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال طیبہ کے مطابق احکام صادر ہونے لگے جبکہ فلاں فلاں لوگوں کے انتساب سے حکم دیا جاتا تھا۔

محدثین کرام نے اپنی عمریں صرف کرکے طرح طرح کے مصائب وآلام برداشت کرکے صحیح وغیر صحیح دونوں قسم کی احادیث مرتب کردی ہیں[۱] ان کے مجموعے آج ہمارے سامنے موجود ہیں، تنقید کے اصول الگ ہم کو بتادیئے گئے ہیں۔ آج اگر کوئی حدیث آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو بیشک

حاشیہ ص۱۸۵۔ [۱] چنانچہ امام بخاری۔ امام نسائی۔ امام صغانی۔ امام مسلم۔ علامہ ابن جوزی نے کتاب الضعفا یا موضوعات کے نام سے کتابیں لکھیں (کشف الظنون ج ۲ ص ۱۸۴) ان کے علاوہ ملا علی قاری نے موضوعات اور علامہ محمد طاہر بن علی نے تذکرۃ الموضوعات لکھی جس کے ذیل میں قانون الموضوعات والضعفاء بھی ہے۔

آپ کو حق ہے کہ اصول کی روشنی میں اس پر کلام کریں جس طرح زمانۂ سلف کے محدثین و ناقدین نے کیا تھا۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ اپنی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے بیک جنبش قلم محدثین کی سالہاسال کی محنتوں اور جانکاہیوں پر خط نسخ کھینچ دیں جن کی کوششیں آج اصل دین کی حفاظت و بقا کی کفیل ہیں اور جن کو ہر زمانہ میں قبول عام حاصل رہا ہے۔ بازار میں بے ایمانی اور مکاری و فریب دہی کے عام ہو جانے کی وجہ سے اگر خالص گھی اور دودھ کا ملنا کمیاب ہو گیا ہے تو یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ آپ سرے سے گھی اور دودھ کا استعمال ہی ترک کر دیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ بدن میں طاقت پیدا کرنے کے لئے ان دونوں کا استعمال از بس ضروری ہے۔ اور پھر چند مخلص و نیک نیت اور ایماندار دکاندار ایسے بھی ہیں جو خالص گھی اور دودھ فراہم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کی سیرت سے متعلق جو روایات ہیں۔ اگر وہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہیں (اور غالباً اس سے انکار منکرین حدیث کو بھی نہیں ہے) تو ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ وضاعین و کذابین کی وجہ سے اگرچہ صحابۂ کرامؓ روایات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔ لیکن یہ انہوں نے نہیں کیا کہ وضع حدیث کے خوف سے روایت کا قبول کرنا ہی مطلقاً ترک کر دیا ہو۔ اسی طرح علامہ ابن جوزی وغیرہ نے بخاری تک کی بعض حدیثوں کی تضعیف کی۔ لیکن یہ انہوں نے بھی نہیں فرمایا کہ جب بخاری ایسی صحیح اور مستند کتاب میں بعض ضعیف حدیثیں درج ہو گئی ہیں تو اب اس کا اور کسی اور کتاب حدیث کا اعتبار باقی نہیں رہا۔ اس لئے حدیث کو ہی تسلیم نہ کرنا چاہیئے۔

کیا عجب تماشا ہے کہ آج منکرین حدیث انکار حدیث کے لئے استدلال کرتے ہیں تو اس میں محدثین کے ہی بنائے ہوئے اصول سے کام لیتے ہیں۔ انہیں کے بنائے ہوئے ضعیف راوی کو

ضعیف اور وضّاع کو وضّاع کہتے ہیں۔ مثلاً ایک دو حدیثیں پیش کر کے وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے یہ قرآن کے خلاف ہیں اس لئے ناقابل اعتبار ہیں ہم کہتے ہیں یہ آپ نے نئی بات کیا کہی؟ یہ تو خود محدثین اصولِ درایت کے سلسلہ میں بیان کر چکے ہیں کہ جو حدیث نص کتاب اور سنت متواترہ کے خلاف ہو اُسے رد کر دینا چاہیئے۔ بس ضرورت اس کی ہے کہ آپ ان دو حدیثوں کا نصِ کتاب کے مخالف ہونا ثابت کر دیں اگر آپ اس میں کامیاب ہو گئے تو ہم بھی آپ کے ہمنوا ہو کر کہیں گے کہ بے شبہ ان حدیثوں کو قبول نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ یہی تو لازم آیا کہ یہ دو ایک حدیثیں قرآنی نص کے مخالف ہونے کی وجہ سے مسترد ہو گئیں اس سے یہ نتیجہ کس طرح لازم آگیا کہ ان دو ایک حدیثوں کی وجہ سے پورا ذخیرۂ احادیث ہی ناقابلِ اعتبار قرار پا جائے۔

منکرینِ حدیث کو غور کرنا چاہیئے کہ اگر وہ کسی ضعیف راوی کو ضعیف۔ کسی وضّاع کو وضّاع کہنے میں محدثین کی رہنمائی کے محتاج ہیں اور انہیں کے قول پر اعتماد کرنے پر مجبور ہیں تو پھر اس چیز میں ان کے اقوال کو معتبر ماننا اور حکمِ حدیث میں ان کو ناقابل اعتبار قرار دینا حد درجہ کی نا انصافی اور زیغ قلب کی دلیل نہیں تو کیا ہے؟ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ

سوال یہ ہے کہ آپ کو آج اس کا یقین کیونکر آیا کہ لوگ وضعِ حدیث کرتے تھے؟ محض محدثین و اربابِ تاریخ کے کہنے سے! پس اگر آپ ان کے اس قول کو صحیح مانتے ہیں تو جب وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اسے درست تسلیم کیوں نہیں کرتے۔

ظنیت حدیث اس موقع پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ منکرینِ حدیث عموماً یہ کہتے ہیں کہ محدثین کی تصریح کے مطابق اخبارِ آحاد مفیدِ ظن ہیں یعنی ان سے یقین حاصل نہیں ہوتا۔

اور قرآن مجید میں بحکم اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا ظن کے قبول کرنے سے منع فرمایا گیا ہے اس لئے احادیث ناقابل قبول ہیں۔

اس دلیل کے جواب میں حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی شارح صحیح مسلم نے مقدمہ فتح الملہم میں بہت واضح تقریر کی ہے۔ ہم اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مشہور یہ ہے کہ اخبار احاد قرائن سے مجرد ہوں تو ظن کا فائدہ دیتے ہیں اور متواتر علم یقین کا۔ اب ہم ظن کے معنی کی تشریح کرتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔ ظن اس کیفیت کا نام ہے جو کسی علامت سے حاصل ہو۔ یہی کیفیت قوی ہو جاتی ہے تو علم بن جاتی ہے، اور جب حد سے زیادہ ضعیف ہو جاتی ہے تو توہم کی حد سے متجاوز نہیں ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ کا ارشاد الذین یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ اور نیز الذین یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوا اللّٰہِ ان دونوں میں ظن بمعنی یقین ہے اس کے برخلاف ان آیتوں

اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ	وہ لوگ جنہوں نے اس میں اختلاف
شَکٍّ مِّنْہُ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ	کیا وہ بے شبہ اسکے متعلق شک و شبہ میں پڑے
اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۔ ۔ ۔	ہیں ان کو اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ بجز ظن
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	کی پیروی کے اور کچھ نہیں
اور وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا	تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرتے ہو
اور وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا	ظن حق کا کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

میں ظن سے مراد وہ اوہام ہیں جو کسی صحیح دلیل کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن مجید سے ظن کے معنی کی اس تعیین و تشخیص کے بعد اب دیکھنا چاہیئے کہ محدثین کے نزدیک ظن سے مراد کیا

ہوتی ہے۔

پس ظن جس کا فائدہ خبر واحد دیتی ہے، وہ کیفیت قوی راجح ہے جو قریب بہ یقین ہو۔ نہ وہ ضعیف مرجوح جو حد توہم سے متجاوز نہیں ہوتی۔ اور ظن بمعنی اول علم کی ایک نوع ہے جس پر اکثر احکام دینی و معاملات دنیوی کا دار و مدار ہے۔ لیکن یہ لفظ مختلف معانی میں مشترک ہونے اور وہم کے معنی میں شائع ہو جانے کی وجہ سے اکثر اشتباہ و التباس کا باعث بن جاتا ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے اور اس قسم کے مقامات میں اس کو استعمال نہ کیا جائے۔ امام فخر الاسلام نے اسی وجہ سے خوب کہا ہے کہ متواتر سے علم یقین اور مشہور سے علم الطمانینت پیدا ہوتا ہے اور خبر واحد سے علم غالب الرای کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر جو شخص اخبار آحاد پر عمل پیرا ہوتا ہے گویا وہ اس چیز کی پیروی کرتا ہے جس کا اسے علم حاصل ہے اس کو ہم اتباع ظن جو مذموم ہے نہیں کہہ سکتے۔ خبر واحد کا قبول کرنا واضح ضرورتوں میں سے ہے جس سے انکار بجز ایک منکر مکابر کے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ ہم شب و روز اپنے معاملات میں اسپر عمل کرتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر مسئلہ اور ہر واقعہ میں خبر واحد کے قبول کرنے کی حیثیت بالکل یکساں ہوتی ہے بلکہ وجدان صحیح اخبار کے باہمی فروق و مراتب کا خود بخود حکم کر دیتا ہے، فرض کیجئے ایک شخص کہتا ہے کہ فلاں صاحب آپ کو بلاتے ہیں تو آپ کو بیسن کر تردد نہیں ہوتا اور اس بات کا یقین آجاتا ہے۔ لیکن اگر یہی شخص آپ سے کہے کہ آپ کو بادشاہ نے اپنی محفل میں بلایا ہے تو اس

خبر کو سن کر آپ کے دل میں اختلاج و انقباض پیدا ہو جاتا ہے اور انشراحِ صدر اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ قرائن و شواہد سے اس کی تائید نہیں ہو جاتی۔ یہی مراد ہے ان لوگوں کی جو کہتے ہیں کہ شہادت بہ قدرِ دعوی اور دلیل بمرتبۂ مدلول ہونی چاہیئے۔ ہمارے علماء محدثین کا تعامل اسی پر ہے[1] الخ

اس تقریر پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں واقعۂ افک کے بارہ میں ہے

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ	تم لوگوں نے جب یہ خبر سنی تھی تو مؤمن
وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۔	مردوں اور عورتوں نے کیوں اچھی بات
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	کا ظن نہیں کیا۔

اس آیت سے جہاں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ظن احتمالِ مرجوح کے معنی میں نہیں آتا بلکہ وثوق کے ساتھ کسی شے کے جاننے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی شے کے متعلق گمانِ غالب پیدا کرنے کے لئے قرائن و آثار موجود ہوں جیسا کہ واقعۂ افک میں حضرت عائشہؓ کی عصمت مآبی و پاک دامانی کا گمان غالب پیدا کرنے کے لئے قرائن موجود تھے تو ہمیں اس پر وثوق اور بھروسہ کر لینا چاہیئے اور اگر ہم قرائن کی شہادت کے باوجود ایسا نہیں کریں گے تو اس پر ہم سے ایسا ہی مواخذہ ہوگا جیسا کہ آیت بالا میں منافقین کی اڑائی ہوئی خبر کو سن کر حضرت عائشہؓ کے معاملہ میں مذبذب ہو جانے والے مسلمان مردوں اور عورتوں سے ہوا۔

ظن کے معنی کی اس تحقیق و تنقیح کے بعد یہ مسئلہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ احادیث سے جو فائدۂ ظن حاصل ہوتا ہے اس کی بنا پر حدیثیں کس حد تک قابلِ عمل ہیں اور ان سے احکام کے

---

[1] مقدمۂ فتح الملہم ص ۸

استنباط میں اور قرآن مجید کی مختلفت الاحتمالات آیات کے معانی کی تعیین میں کس حد تک مدد لیجا سکتی ہے فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ

محدثین کی بے لوث خدمات علم و مذہب

بعض لوگ حدیث کی بے اعتباری ثابت کرنے کے لئے یہ بھی کہتے ہیں کہ حدیث کی تدوین چونکہ خلفائے بنی امیہ اور خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ہوئی ہے۔ اور بعض ائمہ حدیث مثلاً امام زہری خلفاء سے راہ و رسم رکھتے تھے اس لئے حدیث کا ذخیرہ وقت کے عام سیاسی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا۔

اب آیئے تاریخ کی روشنی میں یہ دیکھیں کہ یہ بدگمانی کہاں تک صحیح ہے؟ یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ خلفائے بنی امیہ سیاسی حیثیت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سخت مخالف تھے۔ اور اسی طرح خلفائے بنی عباس حضرت معاویہؓ کو اپنا زبردست سیاسی حریف سمجھتے تھے۔ اس بناء پر اگر محدثین نے ان خلفا کی جنبہ داری کی ہوتی تو بنو امیہ کے عہد میں حدیثوں کا دفتر حضرت معاویہؓ کے مناقب۔ اور حضرت علیؓ کے مثالب سے مملو نظر آتا۔ اور پھر خلفائے عباسیہ اپنے عہد میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کی منقبت میں اور حضرت معاویہؓ کی مذمت میں کثرت سے حدیثیں روایت کرواتے۔ لیکن ذخیرۂ احادیث کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی حدیثوں سے دفترِ احادیث خالی ہے۔ اور مناقبِ صحابہ کے ذیل میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے فضائل بیان بھی کئے گئے ہیں تو ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ انہیں کی کیا خصوصیت ہے اور صحابہ کے فضائل بھی مذکور ہیں اور کہیں کسی کتاب میں اگر اس قسم کی کوئی حدیث ہے بھی

جس سے بے جا حمایت کی بو آتی ہو تو اسے محدثین نے موضوع بتا کر ساقط الاعتبار قرار دیدیا ہے۔

پھر محدثین کے واقعاتِ زندگی دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ گدایانِ سکندر دل کس استغنا کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور بے لوث و بے غرض ہونے کی وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں بڑے سے بڑے جابر و ظالم بادشاہ کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ علم و بصیرت کی روشنی میں جو بات انہیں حق معلوم ہوتی تھی اسے برملا کہتے تھے۔ اور جان و مال، عزت و آبرو کسی چیز کا خیال اعلانِ حق سے انہیں باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ خلفاء سے راہ و رسم رکھنے میں امام زہریؒ اور امام مالکؒ کا نام زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کا بھی حال یہ تھا کہ حق کے معاملہ میں خلیفہ کی رضا جوئی کی ذرا پرواہ نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ولید بن عبدالملک نے امام زہریؒ سے کہا۔ کیا تم کو یہ روایت پہونچی ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی ان میں علیؓ بھی داخل تھے؟ امام زہری نے فرمایا نہیں، البتہ تمہاری قوم کے دو آدمی یعنی۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمن اور ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث نے مجھ سے روایت کی کہ حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا کہ علیؓ اس الزام سے بری تھے

ایک روایت میں ہے کہ ہشام بن عبدالملک کا خیال تھا کہ قرآن مجید میں حضرت عائشہؓ کے واقعۂ افک کے سلسلہ میں جو

والذی تولی کبرہ منھم لہ	جس نے ان میں سے اس الزام میں
عذاب عظیم	بڑا حصہ لیا ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

فرمایا گیا ہے تو اس سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلیمان بن یسار ہشام کے پاس آئے اس نے پوچھا والذی تولی کبرہ سے کون مراد ہے؟ "وہ بولے" عبداللہ بن ابی۔ ہشام بولا۔ جھوٹ کہتے ہو وہ علی ہیں" انہوں نے کہا" امیرالمؤمنین جو کچھ کہتے ہیں وہی اس کو خوب

جانتے ہیں پھر، زہری آئے تو ان سے بھی یہی سوال کیا اور انہوں نے وہی جواب دیا جو سلیمان بن یسار نے دیا تھا اس نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو وہ علی ہیں۔ انہوں نے کہا میں جھوٹ کہونگا؟ تمہارے باپ نہ ہو اگر آسمان سے ایک منادی پکارے کہ خدا نے جھوٹ جائز کر دیا۔ میں تب بھی جھوٹ نہ بولوں گا۔ مجھ سے عروہ، سعید، عبداللہ اور علقمہ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ وہ عبداللہ بن اُبی تھا۔ اس واقعہ کے آخیر میں ہے کہ ہشام نے کہا "ہم نے اس بڈھے کو غصہ ولا دیا"۔[۱]

اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ صاف واقعہ حضرت اعمش کا ہے۔ ایک مرتبہ ہشام بن عبدالملک نے ان کو لکھا کہ آپ حضرت عثمانؓ کے فضائل۔ اور حضرت علیؓ کے معائب قلمبند کر لیجیے انہوں نے خط بکری کے منہ میں ڈالدیا جو اس کو چبا گئی، پھر قاصد سے کہا جا کر کہدینا یہی تمہارا جواب ہے۔ قاصد بولا خلیفہ نے قسم کھائی ہے اگر میں جواب لیکر نہ پہونچا تو وہ مجھ کو قتل کر دے گا۔" یہ سنکر حضرت اعمش نے مجبوراً جواب لکھا۔ اے امیر المؤمنین اگر حضرت عثمانؓ میں تمام دنیا کی خوبیاں ہوں تو وہ تمہارے لئے مفید نہیں اور اگر حضرت علیؓ میں تمام جہان کی برائیاں ہوں تو وہ نقصان رساں نہیں صرف اپنی ہی ذات کا خیال رکھو۔[۲]

حجاج بن محمد بن یوسف ثقفی ظلم و ستم کی دنیا کا نمایاں ہیرو ہے ایک مرتبہ اس کے سامنے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا تو اس نے کہا۔" وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریات میں داخل نہ تھے۔ اس مجلس میں یحیٰ بن یعمر موجود تھے انہوں نے کہا۔" اے امیر تو جھوٹ بولتا ہے" بولا۔" اس پر قرآن سے دلیل لاؤ ورنہ میں تم کو قتل کر دونگا انہوں نے یہ آیت پڑھی

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ — انہیں کی نسل میں سے داؤد، سلیمان

[۱] فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۶ و ۲۳۷ طبع قدیم [۲] ابن خلکان ج ۲ ص ۲۱۳، ۲۱۴

وَاَیُّوبَ وَیُوسُفَ وَمُوسٰی وَ	ایوب یوسف موسی اور ہارون ہیں
ھَارُونَ وَکَذٰلِکَ نَجْزِی	اور ہم نیک کام کرنے والوں کو ایسے
الْمُحْسِنِینَ وَزَکَرِیَّا وَیَحْیٰی وَعِیسٰی	ہی صلہ دیتے ہیں اور ایسے ہی ہیں زکریا یحیٰی
وَاِلْیَاسَ	عیسی اور الیاس علیہم السلام ہیں

اور پھر کہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ماں کے ذریعہ سے حضرت آدم کی نسل میں داخل ہیں پس اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ماں کے واسطہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں داخل ہیں۔ حجاج بولا۔ تم کہتے تو سچ ہو۔ لیکن یہ بتاؤ تم نے میری مجلس میں مجھ کو کیوں جھٹلایا۔ فرمایا اس معاہدۂ خداوندی کی وجہ سے

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیثَاقَ الَّذِینَ	اور جب اللہ نے اہل کتاب سے یہ وعدہ لیا کہ
اُوتُوا الْکِتَابَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا	وہ کتاب کو لوگوں کے سامنے بیان کریں گے
تَکْتُمُونَہٗ فَنَبَذُوہُ وَرَاءَ ظُھُورِھِمْ	اور اسکو چھپائیں گے نہیں ان لوگوں نے اس
وَاشْتَرَوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیلًا	قول و قرار کو پس پشت ڈال دیا

حجاج اس حق گوئی کی تاب نہ لاسکا۔ اور حضرت یحیٰی بن یعمر کو خراسان کی طرف جلاوطن کردیا ؎

امام اوزاعی شام کے امام تھے وہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب سفاح کا چچا عبداللہ بن علی شام میں آیا تو اس نے ایک دربار منعقد کیا اور اس میں مجھ کو بلایا۔ میں وہاں پہنچا تو سواری سے اتار لیا گیا۔ اور دو آدمیوں نے میرے بازو پکڑ کر مجھ کو ایسے مقام پر کھڑا کردیا جہاں سے وہ میرا کلام سن سکے۔ اب اس نے پوچھا۔ عبدالرحمن بن عمرو الاوزاعی تمہارا ہی نام ہے۔ ؟

؎ شذرات الذھب ج ۱ ص ۱۷۶

میں نے کہا، اللہ امیر کی اصلاح کرے، یہ میرا ہی نام ہے۔ بولا "بنو امیہ کی خونریزی کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ تھا۔ اس لئے مناسب یہ تھا کہ تم اس کو پورا کرتے"۔ وہ بولا "ہمارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ اوزاعیؒ فرماتے ہیں اس وقت میرا دل سراسیمہ ہو گیا۔ لیکن قیامت کے دن خدا کے خوف کا تصور کیا تو بہت ڈرا اور اضطراب جاتا رہا"۔ اس لئے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ بنو امیہ کا خون تم پر حرام تھا وہ یہ سن کر اس قدر برہم ہوا کہ آنکھیں نکل آئیں اور گردن کی رگیں پھول گئیں، کہنے لگا، خدا تم پر رحم کرے تم نے ایسا کیونکر کہا۔ میں نے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کسی مسلمان کا خون اس وقت تک جائز نہیں جب تک تین حالتوں میں سے ایک حالت پیش نہ آئے۔ یا تو اس نے شادی شدہ ہونے کی حالت میں زنا کیا ہو۔ یا کسی کو قتل کر دیا ہو۔ یا وہ مرتد ہو گیا ہو"۔ عبداللہ بن علی نے کہا۔ کیا ہماری حکومت دینی نہیں ہے۔؟ میں نے کہا۔ کیونکر؟ کہنے لگا۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے لئے وصیت نہیں کی تھی۔ میں نے کہا "اگر وصیت کی ہوتی تو دو شخصوں کو حکم نہ بناتے"۔ اس پر وہ مارے غصہ کے آگ بگولا ہو گیا۔ اب مجھے یقین تھا کہ میرا سر قدموں پر گرا چاہتا ہے۔ لیکن اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ان کو نکالدو۔ میں وہاں سے نکل کر تھوڑی دور آیا تھا کہ میرے پاس ایک سوار آیا۔ میں سمجھا "یہ میرا سر کاٹنے آیا ہے" اس خیال سے میں سواری سے اترا کہ دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ اس نے سلام کیا اور کہا کہ امیر نے آپ کے پاس دنانیر بھیجے ہیں، امام ہمامؒ نے یہ دینار قبول تو کر لئے لیکن فیاضی اور سیر چشمی کا یہ عالم تھا کہ گھر پہونچتے پہونچتے ختم کر دیتے[1]

یہ چند واقعات مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ محدثین کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۷۰۔ ۱۷۱

آپ کو بے شمار واقعات اسی قسم کے نظر آئیں گے۔ کسی حاکمِ وقت یا بادشاہ کی استرضا کے لئے حدیثیں وضع کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ کوئی محدث کسی جزئی مسئلہ میں جو رائے رکھتا تھا وہ بادشاہ کی رضامندی کے لئے اس کے اعلان و اظہار سے بھی باز نہیں آتا تھا۔ امام مالکؒ فرماتے تھے۔ جبری طلاق واقع نہیں ہوتی۔ منصور نے اس پر ناراض ہو کر ان کو نہایت بے رحمی کے ساتھ ذلیل کیا۔ لیکن امام جنت مقام پھر بھی یہی کہتے رہے۔ جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے۔ اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں انس کا بیٹا مالک ہوں اور کہتا ہوں کہ طلاقِ مکرہ واقع نہیں ہوتی۔ اور اس کی کوئی حقیقت نہیں

امام احمد بن حنبلؒ کو دُرّوں سے مارا گیا۔ شدید سے شدید عقوبت دی گئی لیکن وہ بدستور اسی کا اعلان کرتے رہے القرآن کلام اللہ غیر مخلوق تو کیا جو ائمہ دین چیزوی فقہی مسائل تک پر حکومت کی مخالفت اور جسمانی تکلیف و اذیت کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، ان سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ انہوں نے خود احادیث وضع کی ہوں گی۔ یا احادیث موضوعہ کے قبول کرنے میں تساہل و تکاسل سے کام لیا ہوگا؟ سبحانک ھذا بھتان عظیم

محدثین کرام کی یہ جماعت مادی اعتبار سے کتنی ہی بے بضاعت اور بے سروسامان ہو۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ لوگ گدایان دارا دل و سکندر دماغ تھے۔ اپنے ذریعہ معاش سے انہیں جو کچھ ملتا تھا اس پر صبر و شکر کے ساتھ قناعت کرتے تھے اور کسی سلطنت و حکومت کے جاہ و جلال اور دولت و ثروت کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت سعید بن المسیب کے پاس چار سو دینار تھے وہ اسی سے تجارت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خلافت بنو امیہ کی جانب سے ان کی خدمت میں ۳۰ ہزار درہم پیش کئے گئے۔ لیکن انہوں نے فرمایا۔

لا حاجۃ لی فیھا ولا فی بنی — مجھ کو نہ درہموں کی ضرورت ہے اور نہ

مروان حتی القی اللہ فیحکم بینی وبینھم[۱] — بنومروان کی۔ یہاں تک کہ میں اللہ سے ملوں اور وہ میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے۔

خلفا سے ان بزرگوں کی بے نیازی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ عبدالملک بن مروان نے ہرچند چاہا کہ حضرت سعید بن المسیب اپنی صاحبزادی کا نکاح اس کے لڑکے اور ولی عہد ولید سے کردیں لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک دن جب شدید سردی پڑرہی تھی۔ عبدالملک نے انہیں پٹوایا۔ اور ان پر پانی بہانے کا حکم[۲] دیا

محدثین کی احتیاط کوشی کا یہ عالم تھا کہ اتقوا مواضع التھم کے مصداق خلفاء اور امرا کے عطیات اور تحائف بھی قبول نہیں کرتے تھے ایک دفعہ جعفر برمکی نے حضرت عیسٰی بن یونس کو ایک لاکھ درہم پیش کئے۔ تو انہوں نے بکمال استغنا یہ کہکر واپس کردیا کہ کہیں اہل علم یہ نہ کہیں کہ میں نے حدیث کی قیمت لے[۳] لی، مامون رشید نے بھی ان کو دس ہزار کی رقم دینی چاہی لیکن انہوں نے اس کے قبول کرنے سے بھی انکار کردیا۔ اور فرمایا ولا شربت ماء یعنی حدیث کے معاوضہ میں تو میں ایک گھونٹ پانی بھی قبول نہیں کرونگا۔[۴]

ایک بار امیر یمن نے حضرت طاؤس بن کیسان کی خدمت میں پانسو دینار بھیجے لیکن انہوں نے ان کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ امام ابوحنیفہؒ تجارت کرکے زندگی بسر کرتے تھے۔ اور سلاطین کے عطیات قبول نہیں کرتے تھے۔ خلیفہ مکتفی باللہ نے امام محمد بن جریر طبری سے ایک کتاب لکھوائی اور اس پر ان کو صلہ دینا چاہا تو انہوں نے قبول کرنے سے صاف انکار کردیا۔ لوگوں نے کہا ضرورت کے مطابق کچھ تو لے لیجئے۔ فرمایا میں امیرالمؤمنین سے درخواست کرونگا کہ جمعہ کے دن سوال کرنے کی ممانعت کردیں۔[۵]

[۱] ابن خلکان ج ا ص ۲۰۲ [۲] ابن خلکان ج ا ص ۲۰۷ [۳] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۵۸ [۴] تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۲۵۹ [۵] ان واقعات کے لئے دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۱۔ ان بزرگوں کے تراجم

تبائیے کیا ایسے بے نیاز، بے لوث، خود دار اور مخلص و دیانت شعار بزرگوں کی نسبت حدیثیں وضع کرنے یا احادیث ضعیفہ و موضوعہ کے قبول کرنے میں کسی قدر بھی جنبہ داری یا کسی کی رو رعایت کرنے کا شک اور شبہ کیا جاسکتا ہے؟ ہاں بدگمانی یا منطقیانہ و فلسفیانہ شبہات کا علاج نہیں۔ جن کی وجہ سے دنیا کی سب سے زیادہ یقینی چیز بھی غیر یقینی قرار پاسکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ دینوی اور دینی احکام و امور پر اس شک کا مطلقاً کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایسے شکی لوگوں کی نسبت ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

وما علینا الا البلاغ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ایک خط اور اس کا جواب

آخر میں ہم اس خط کو مع اس کے جواب کے درج کرتے ہیں جو رسالہ برہان میں "فہم قرآن" کی تین قسطیں ملاحظ فرمانے کے بعد ہمارے محترم دوست مولانا عبدالمالک صاحب آروی نے لکھا تھا اور جس میں انہوں نے اپنے بعض ایسے شکوک وشبہات کا اظہار بے تکلفی کے ساتھ کر دیا تھا جو غالباً اکثر انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں گذرتے ہونگے

حضرت مولانا صاحب زاد کرمہ۔ السلام علیک

آج برہان "ملا آپنے فہم قرآن" کے سلسلہ میں چودہ علوم کی معرفت لازم ٹھہرائی ہے، لغات، صرف ونحو اور تفاسیر صحابہ (یعنی احادیث کی کتب تفسیر) کے علاوہ اور کون علوم ہیں؟ اور پھر سوال یہ ہوتا ہے کہ کسی فقیہہ یا عالم دین کی اس اپیچ یا اجتہاد سے معارف قرآن اور نکاتِ قرآن پر نقادانہ نظر ڈالنے کے لئے ان چودہ علوم کا جاننا لازم کیسے آسکتا ہے میں اس کو نہیں سمجھا ذرا تفصیل سے سمجھائیے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جتبک درس نظامی کی فرسودہ کتابوں پر سر کھپایا جائے فہم قرآن، تدبر فی القرآن کی منزل آہی نہیں سکتی، اب آپ ہی فرمائیے کہ اللہ میاں باوجود اس قدر رحم وکرم کے ایسا جبر کیونکر پسند فرمائیں گے، چودہ علوم؟ معاذ اللہ! تو کیا باضابطہ ایک شخص بی اے پاس کرکے اگر لغات صرف ونحو اور احادیث کی مدد سے قرآن مجید کے دقائق ونکات سمجھنا چاہے تو گویا وہ اس سے بالکل محروم رہے گا۔ کیونکہ اب اس کے پاس وقت تو ہے نہیں کہ آٹھ سال تک دیوبند یا ندوہ جاکر حصولِ خیر وبرکت کرے۔ حالانکہ جہاں تک متن کے ترجمہ کا تعلق ہے

اور اس سے استنباطِ مسائل کا، لاطینی اور انگریزی زبانوں میں قرآن مجید کے متعلق ایسی ایسی کتابیں ملتی ہیں کہ عہد حاضر میں کسی ندوی یا (معاف کیجئے) دیوبندی کا وہاں تک گزر بھی نہیں ہوسکتا، اسی پر نیاز بگڑتے ہیں تو آپ چیں بجبیں ہوتے ہیں، بایں علم و فضل، روشن خیالی و وسعت مشربی آپ پر بھی مولویوں کی "برہمنیت" طاری ہوگئی۔ اور آپنے ویدوں کی طرح تعلیماتِ قرآنی اور اس کے فہم و عرفان کو بھی اپنی جماعت تک محدود کرلیا

"خدا توفیق کیش کفر بخشد دیں پناہاں را"

محب محترم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

والا نامہ آیا، آپ یقین کیجئے میں کسی کی تنقید سے ناراض نہیں ہوتا، چہ جائیکہ آپ ایسے مخلص دوست کی تنقید سے جس کی نیت جس کے خلوص و محبت پر مجھ کو اعتمادِ تام ہے۔ آپ اس سے بھی زیادہ سخت اور ترش لہجہ میں کہیئے میں بُرا نہیں مانونگا۔ مگر ہاں شرط یہ ہے کہ آپ کا خلوص جو میرے ساتھ ہے اس خلوص سے کم نہ ہونے پائے جو آپ کو حضرت نیاز سے ہے۔ جس چیز پر تنقید کی گئی ہے اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اول تو آپ اس معنی کو پیش نظر رکھیئے جو میں "فہم قرآن" سے مراد لیتا ہوں۔ اور جس کو سامنے رکھ کر میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ میرا مقصد جیسا کہ میں نے اس مضمون کے دوسرے نمبر میں تحریر کردیا ہے فہم قرآن سے یہ ہے کہ کوئی شخص اس کو پڑھ کر مجتہدانہ طور پر استنباط احکام کرسکے اور کلام کے مدلول و منطوق کو کماحقہٗ سمجھ سکے، تو اب اس معنی کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ استنباطِ احکام کا حق کس کو حاصل ہے، اور کون مجتہدانہ طور پر قرآن کے فہم کا ادعا کرسکتا ہے۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں فہم قرآن کے اس معنی کو ملحوظ رکھ کر لکھ رہا ہوں۔ ورنہ اگر آپ فہمِ قرآن سے احکام امر و نہی کو معلوم کرنا اور جو مضامین اس میں بیان کئے گئے ہیں ان کو سطحی طور پر جان لینا مراد لیتے ہیں تو میں آپ کی مخالفت نہیں کرونگا۔ اور اس اعتبار سے شبہ

فہم قرآن کے لئے شرائط وہ نہیں ہیں جو میں لکھ رہا ہوں۔

جہاں تک اس مسئلہ کی اصل حقیقت کا تعلق ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ کسی بحث ونظر کی ضرورت ہی نہیں۔ دیوان غالب کو دہلی اور لکھنؤ کے لوگ جسطرح پڑھتے ہیں ایک پشاوری بھی اس سے اتنا ہی مزہ لیتا ہے۔ لیکن کیا اس پر تنقید کا حق ہر ایک کو حاصل ہے؟ کیا اس پر نقد کرنے کے لئے اردو زبان کے مالہٗ وماعلیہٗ اس کے محاورات وطرق استعمال، قواعد، فصاحت وبلاغت کے آئین وضوابط، ذوقِ شعری، فلسفہ وغیرہ وغیرہ کیا ان چیزوں کے نہ صرف جاننے بلکہ ان میں ایک نظر وسیع پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ غالب کا یہ شعر:-

مری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس کا تھوڑا بہت مطلب ہر اردو خواں اور کالج کا ہر ایک گریجویٹ سمجھ سکتا ہے۔ لیکن کیا اس کی شرح کا حق ہر ایک کو ایسا ہی ہے جیسا کہ عبدالرحمن بجنوری مرحوم، عبدالمالک آردی، نیاز فتحپوری اور حسرت موہانی کو ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر آپ کلام مجید کے متعلق اسی حیثیت سے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہ ایک متکلم کا کلام ہے۔ کس طرح یہ فرما سکتے ہیں کہ اس کے مدلول ومنطوق کو سمجھنے کے لئے عربی کی معمولی شُدبُد کافی ہے، اس ادعاء سے آپ کے خیال واستنتاج کے برعکس ویدوں کی طرح قرآن مجید کا اسلامی برہمنوں کے ساتھ مخصوص ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ ہمارے ادعاء کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو مجتہدانہ طور پر سمجھنے کے لئے چند شرائط ہیں ٹھیک ایسے ہی جیسے ہر آسان سے آسان علم وفن میں کمال پیدا کرنے کے لئے چند شرائط ہوتے ہیں۔ ہر شخص جو ان شرائط کو پورا کر سکے گا۔ فہم قرآن کا مدعی ہو سکتا ہے۔ اس میں ذات، پات مقام ونسب وغیرہ کسی کی کوئی قید نہیں، جس طرح طب آسان ہے، مگر اس کے لئے قانون شیخ وغیرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ہر شخص

ڈاکٹر، وکیل اور پروفیسر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس نے ایم بی، بی ایس، ایل ایل بی، یا ایم اے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہوں اسی طرح ہم کہتے ہیں قرآن آسان ہے۔ ہر شخص کو اس میں تدبر اور تفکر کرنا چاہیئے۔ مگر اس کے لئے چند شرائط ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ادعا سے میری ”برہمنیت“ کس طرح لازم آجاتی ہے۔

اب رہا چودہ علوم کی شرط کا معاملہ تو یہ واضح رہنا چاہیئے کہ یہ چودہ علوم براہ راست فہم قرآن کیلئے فرض نہیں، بلکہ علماء ادب و بلاغت کے نزدیک کوئی شخص عربی نظم و نثر کو کما حقہٗ سمجھ نہیں سکتا جبتک وہ ان علوم میں دسترس نہ رکھتا ہو اور فہم قرآن کیلئے اولین ضرورت عربی کلام کو کما حقہٗ سمجھنے کی صلاحیت ہے اس بناء پر لازم آگیا کہ فہم قرآن عجمیوں کیلئے ان علوم کے بغیر دشوار ہے یہ کس نے کہا کہ ندوہ، یا دیوبند میں ہی ان علوم کی تحصیل کیجیے بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان علوم کی بھی ضرورت نہیں اگر آپ کسی اور طریقہ سے کلام عربی کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں تو سبحان اللہ! لیکن اگر ان علوم ادب کے بغیر امراء القیس، اعشیٰ، طرفہ کے عربی کلاموں کو ان کی فصاحت و بلاغت کے ادراک و شعور کے ساتھ سمجھ نہیں سکتا، تو ظاہر ہے ان کے بغیر قرآن مجید کو جو عربی زبان کی انتہائی فصیح و بلیغ کتاب ہے کس طرح سمجھ سکتا ہوں۔ پس ہر وہ شخص جو آج فہم قرآن کا مدعی ہے اس سے دریافت کیجئے کیا وہ شعر عرب کو جانتا ہے؟ کیا وہ عربی شعراء کے کلام کو بے تکلف سمجھ سکتا اور ان کے نکات و لطائف کو معلوم کر سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اسے کیا حق ہے کہ وہ محض ترجمہ کی مدد سے قرآنی آیات کی تشریح و توضیح شروع کر دے۔ اقبال کی رموز بیخودی کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ لیکن بتایئے کیا ایک انگریزی ترجمہ کے ذریعہ اقبال کو جاننے والا اقبال کے کلام سے اتنا ہی محظوظ ہو سکتا ہے جتنا ایک ایرانی یا فارسی کا کوئی خوش مذاق شخص؟

آپ نے مجھ کو مولویانہ ”برہمنیت“ کا طعنہ دیا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ میں ”ہر بوالہوس کی حسن پرستی“ گوارا نہیں کر سکتا، ہاں ”شیوۂ اہل نظر“ رکھنے والے

ہم عجمی اگر حسبِ ضرورت ان علوم کو حاصل کر لیں

شوق سے آئیں اور قرآن کے حسن جہاں آرا کے جلووں سے بہرہ اندوز ہوں۔ میں حسن کو صرف ایک تفریحی نظربازی کی چیز نہیں سمجھتا، بلکہ میں اس کی بارگاہ میں سودائے عشق سے بھرے ہوئے سروں کو خم دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ بجا لکھا ہے کہ غریب ندویوں اور دیوبندیوں کو تو اُن کتابوں کی ہوا بھی نہیں لگتی جو لاطینی اور انگریزی زبانوں میں قرآنِ مجید کے متعلق موجود ہیں لیکن سوال صرف یہ ہے کہ اس سے نقص کیا لازم آیا؟ دیا وہ سے زیادہ یہی کہ ایک غیر زبان دان نے جو تفسیر کی تھی وہ معلوم نہیں ہو سکی، لیکن اگر ایک شخص عربی نہیں جانتا تو آپ جانتے ہیں، وہ قرآن فہمی کے اعتبار سے کس قدر گھاٹے میں ہے وہ اس زبان کو نہیں جانتا جس میں قرآن نازل ہوا، اس کے اقوال و افعال سے بے خبر ہیں جس پر قرآن اترا، اس ماحول سے ناآشنا ہے جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ اور ان چیزوں کے متعلق اگر اس کے پاس چند معلومات ہیں بھی تو ان لوگوں کی دی ہوئی جن کو "اجنبی" یا "مردِ بیرون خانہ" کہا جا سکتا ہے۔ اب فرمائیے نقصانِ عظیم میں کون ہے؟ پہلا شخص یا دوسرا؟ بھائی اس دور میں سب سے بڑی مصیبت تو یہی ہے کہ ہم قرآن کی تفسیر بھی ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ کے بجائے انگریزوں کی زبان سے سننا چاہتے ہیں۔ کہیے کیا آپ کی غیرت گوارا کریگی کہ آپ اردو کے ایک شعر کا مطلب داغ و امیر کے بجائے کسی انگریز سے دریافت کریں، درآنحالیکہ وہ اردو کے ذوقِ شعری سے ناآشنائے محض ہو۔

آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ کی شرط کے مطابق ایک شخص جو بی اے" ہے اور تدبر فی القرآن کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس سے یہ کہہ دیا جائے کہ تم پہلے چودہ علوم حاصل کرو تب اس قابل ہو سکتے ہو تو اس سے نرا جبر لازم آئے گا۔ اور اللہ تعالیٰ اس قدر فضل و کرم کے باوجود کس طرح یہ جبر گوارا کریگا" میں کہتا ہوں کہ اگر ہر شخص طبیب نہیں ہو سکتا تو کیا وہ اپنے امراض کے علاج کے لئے کسی طبیب حاذق پر اعتماد نہ کرے، آپ کی تحریر سے تو یہ لازم آتا ہے کہ ہر شخص جسے اپنے کسی

مرض کے علاج کی ضرورت ہو اسے طب حاصل کرنی چاہیئے۔ ہر شخص جو عدالت میں کوئی مقدمہ لڑنا چاہتا ہو اُس کو بیرسٹری کا ڈپلومہ لینا چاہیئے، جس شخص کو مکان بنانے کی ضرورت ہو اسکو انجنیری کی تعلیم حاصل کرنی ضروری ہے اور اسی طرح جو شخص قرآن مجید میں تدبر کرنا چاہتا ہے وہ تمام مشاغل دنیویہ کے ہوتے ہوئے بھی قرآن کو مجتہدانہ طور پر سمجھ سکتا ہے، پس ہر شخص کو اجتہادی طور پر "تدبر فی القرآن" کی دعوت دینا یہ جبر ہے یا یہ کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کیا جائے اور ہم جسطرح دنیوی معاملات میں ڈاکٹروں، بیرسٹروں، پروفیسروں اور انجنیروں کی جماعت پر اعتماد کرتے ہیں اسی طرح دینی ومذہبی معاملات میں بھی ایک جماعت ہو جس پر ہم اعتماد کلی کریں اور ہر ایک شخص سے یوں نہ کہیں کہ اُس کو خود اس جماعت (علماء دین) سے بے پروا ہو کر اپنی رائے اور عقل کے مطابق تفسیر کرنی چاہیئے۔ آپ شوق سے تدبر فی القرآن کیجئے خدا آپ کے عزائم میں برکت اور حوصلوں میں وسعت عطا فرمائے لیکن اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اس کو محض اس بنا پر کہ وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آتی ہے، اور اگرچہ اس کو بڑے بڑے ائمہ کرام نے لکھا ہے، رد نہ کیجیئے۔

کمیٹی نے

جامعہ عثمانیہ

۱۔ [illegible]

۲۔ [illegible]

۳۔ [illegible]

۴۔ [illegible]

۵۔ [illegible]

۶۔ [illegible]

۷۔ [illegible]

۸۔ [illegible]

۹۔ [illegible]